نگار

قیمت ۸ر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شائع ہوتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائے گا۔

سالانہ قیمت پانچ روپیہ ـــ ششماہی تین روپیہ

بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۲	فہرست مضامین ستمبر ۱۹۳۶ء	شمارہ ۳

ظات ـــــــ ۲
ت اور انسان کی جنگ ـــ محمد عاقل ایم اے علیگ ۹
(افسانہ) ـــــ ایم اے زبیر احمد ۲۳
ی زبان کی پیدائش پر ایک مورخانہ نظر ـــــ ۲۹
وتی (افسانہ) ـــــ ڈاکٹر اعظم کریوی ۵۴
ب المراسلۃ والمناظرۃ (عید نوروز) ۶۶
ب الاستفسار (ازدواج بے خلوت) ۷۰
لوبات :ـــ سیر محشرستان ـــ عدم ۷۴
نشاط روح ـــــ کوکب شاہجہاں پوری ۷۵
چاند ـــــ محمد یحییٰ (اعظم گڈھ) ۷۶
زندگی کا طوفان ـــ باقی صدیقی (راولپنڈی) ۷۷
ناتمامی ـــــ علی اختر (حیدرآباد دکن) ۷۸
صبح افروز ـــــ فطرت واسطی ۷۹
تبصرہ ـــــ امین حزیں ۸۰
غزل ـــــ افسر صدیقی (امروہوی) رر
تذکرہ معرکہ سخن ـــ عبدالباری آسی ۱۳ تا ۱۲۸

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۲	ستمبر سنہ ۱۹۳۲ء	شمار ۳

ملاحظات

تقریباً ایک ماہ قیام کرنے کے بعد ۲۰ راگست کو میں پھر لکھنؤ آگیا اور آفتاب کو قہر وجلال کے جس عالم میں چھوڑ کر گیا تھا واپس آکر پھر اُسی جانگداز کیفیت غیظ و غضب میں پایا۔ سنا ہے کہ میری غیبت میں یہاں بارش بھی ہوئی ٹھنڈی ہوائیں بھی چلیں، لیکن ——— "یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا"۔ مجھے کیا جب تک یہاں رہا آفتاب کی گرم نگاہی کا شکوہ طراز بنا رہا، حیدرآباد پہونچا تو وہاں کی سرد فضا میں بہت سی دل دکھانے والی تمناؤں کا حسرت گزار ——— الغرض وہ شخص جس کے لئے "غمزۂ ناہید" بھی "قہر مریخ" کے برابر ہو، اس کو شکوہ وشکایت کا کیا موقعہ؟

میں جس زمانہ میں حیدرآباد پہونچا وہ زمانہ تھا، اربعین محرم کے بعد کا، میلاد نبوی کا اور گیارہویں کا (جسے یہاں یازدہم شریف کہتے ہیں) کہیں مجالس عزا برپا ہو رہی تھیں، تو کسی جگہ ولادت نبوی کی تقریب میں محافل وعظ کا

تمام ہو رہا تھا، کسی کے دولت کدہ پر اگر ڈھولک کی تھاپ بزم حال وقال میں گرمیاں پیدا کر رہی تھی، تو کسی طریقت
نہ میں "کرامات غوثیہ" کے اذکار سے لوگوں کے جسموں پر "تشعریرہ" طاری کیا جا رہا تھا۔ الغرض جدھر دیکھئے
ب ہنگامہ تھا نمائش مذہبی کا، گرائش عقیدت کا، پرستش خیال کا، فناد گیٔ عقل وروح کا اور شیفتگیٔ احساس و
عتقاد کا —— تمام اکناف ہند سے علماء ومشائخ، فقراء وصوفیہ، واعظین ومرشدین مختلف وضع ولباس
ختلف سج دھج، اور مختلف اہتمامات فنی سے مسلح وآراستہ کھنچ کھنچ کر یہاں آ رہے تھے۔ اور سلسلۂ وعظ وتبلیغ
شد وہدایت پوری گرمی اور گہما گہمی کے ساتھ جاری تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر چودھویں صدی ہجری کا
ئی قطعۂ زمین حشر کے دن صرف اعلاء کلمۃ الحق کی منطقی حجت کی بنا پر سند مغفرت پانے والا ہے تو شاید ہی
سرزمین دکن کے مقابلہ میں کسی اور قطعۂ ارض کو اولیت کا فخر حاصل ہو —— پھر یہی نہیں کہ ان اکابر علم وفضل
ور ان اعاظم شریعت وطریقت کا وقت بالکلیہ خدمت دین ومذہب ہی میں "خاشعانہ وخاضعانہ" طور پر بسر
وتا ہو، بلکہ وہ بمصداق "ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ" مادی وتمدنی زندگی کی فلاح کے لئے بھی "اسی
فدویانہ وسائلانہ" انداز سے منہمک نظر آتے ہیں جو غالباً دولت کی طرف سے اولین خراج کے طور پر ہر شخص سے
وصول کیا جاتا ہے ——

صبح کی نماز اور اوراد واشغال کے بلند بانگ پروپگنڈا کے بعد موٹروں میں بیٹھ کر (جن کے متعلق انھیں
مطلق خبر نہیں کہ اُن کا پٹرول کہاں سے اور کتنا آتا ہے) امراء کے دولتکدوں پر پہونچنا، ان کی فقیر دوستی
و تصوف نوازی کی تعریف میں پہلے ایک قصیدۂ منثور پڑھنا اور پھر لاہوت وجبروت، ابدیت وازلیت
عبدیت ومعبودیت کے عجیب وغریب نکات بیان کرکے، "اشارتاً وکنایتہً" اپنی ہستی کو مبدء فیاض کے تمام
برکات وفیوض کا مرکز حقیقی اور "مہبط انوار الٰہی" قرار دینا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کوئی آسان بات ہے؟
نہ انکی زبان تھکتی ہے نہ دماغ، بیٹھے بیٹھے نہ اُن کے اعضاء میں خستگی وتعطل کی کیفیت پیدا ہوتی ہے نہ
معدہ میں "تکاثف ریاح" کی۔ صاحب خانہ پہلو پر پہلو بدل رہا ہے لیکن ان کی "مربع نشینی" میں مطلق کوئی
فرق نہیں آتا، وہ کسی نہ کسی بہانہ سے زنانخانہ کے اندر چلا جاتا ہے، لیکن یہ مذہبی "قرق امین" اسی تیور سے
ہر ہر چیز کا جائزہ لیتے رہتے ہیں حتیٰ کہ وہ پھر باہر آتا ہے اور اپنے آپ کو پھر اس انداز سے اُن کے سپرد
کر دیتا ہے۔ گویا کہ غریب پر کوئی عمل جراحی ہونے والا ہے ——

دوسرے اہل دنیا واہل غرض بیٹھے ہوئے مُنھ تک رہے ہیں، موقع کے منتظر ہیں، لیکن ان بے غرض
حضرات اہل دین کی گرفت ایسی معمولی نہیں ہوتی کہ کوئی آسانی سے چھوٹ جائے۔ آخر سب لوگ سلام کرکے
رخصت ہو جاتے ہیں اور دوسروں کو تھکا کر یہ خود کبھی نہ تھکنے والا اللہ کا خاص بندہ اپنے آپ کو "قطب وقت"

ثابت کرنے کے لئے بدستور ڈٹا رہتا ہے۔ خواہ مغرب کی نماز قضا ہی کیوں نہ ادا کرنی پڑے —— داستان امیر حمزہ میں "تسمہ پا" مخلوق کے واقعات دیکھ کر یقین نہ آتا تھا، لیکن حیدر آباد میں اس کا مشاہدہ روزانہ ہو سکتا ہے۔ آپ جس امیر کے دربار میں چلے جائیے کوئی نہ کوئی تسمہ پا وہاں ضرور موجود ہوگا۔ اور اس کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ جب وہ آئے گا تو مصافحہ ضرور کریگا اور قریب ترین نشست پر قابض ہو جائیگا مزاج پرسی کے بعد ہی، گزشتہ ۲۴ گھنٹوں کے اندر اپنے مواعظ و انہماکات مذہبی کی داستان چھیڑ دیگا اور پھر جو کرامات اولیا و خوارق عادات کا ذکر شروع کریگا تو اس وقت تک دم نہ لیگا جب تک سارے مجمع کو فرط حیرت سے "صنمکدہ" نہ بنا دے ——

ان حضرات کے مواعظ کیا اور کس قسم کے ہوتے ہیں؟ اب اس کی تفصیل نہ پوچھئے۔ کیونکہ تیسرے درجہ کا تمام وہ لٹریچر جسے نہ "صحت تاریخی" سے کوئی تعلق ہوتا ہے نہ "استشہاد قرآنی" سے ان کے نوک زبان ہوتا ہے اور شاید "روما و یونان" کے "صنمیات" میں بھی وہ حکایات نہ پائی جاتی ہوں جنھیں یہ علمبرداران مذہب، تاریخ اسلام و مذہب اسلام سے منسوب کرتے رہتے ہیں۔

ایک صاحب نے جو بڑے پایہ کے محقق و مورخ مانے جاتے ہیں، نمرود اور جناب ابراہیم کی حکایت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ جب نمرود نے ان کو آگ میں ڈالنا چاہا تو سلطنت کے طول و عرض میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ ہر شخص کا سالانہ خراج معاف ہے بشرطیکہ وہ ایک گٹھا لکڑی کا لا کر جمع کرے۔ میں سن رہا تھا اور حیران تھا کہ ایک شخص کے جلانے کے لئے لکڑی کے اتنے انبار کی کیا ضرورت تھی اور جب تمام ملک کے آدمیوں نے اس کی فراہمی میں حصہ لیا ہوگا تو یہ انبار زمین کے کتنے حصہ کو محیط ہوا ہوگا اور نمرود کو کتنا انتظار کرنا پڑا ہوگا پھر یہ کہ وہ کتنا بڑا میدان رہا ہوگا جہاں اتنی لکڑی جمع کی گئی ہوگی، اور جب اتنے بڑے انبار میں آگ دی گئی ہوگی تو اس کی لپٹ سے صحرا کے کتنے جانور جل کر راکھ ہو گئے ہونگے۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا خالص لکھنؤ کی ٹکسالی زبان میں وعظ فرما رہے تھے انداز بیان میں خاص دلکشی رکھتے تھے، آیات قرآنی کو پوری قرأت کے ساتھ پڑھتے تھے، آواز کے نشیب و فراز میں ایک ملہمانہ کیفیت پیدا کرنے پر پوری طرح قادر تھے، لیکن جو کچھ وہ فرما رہے تھے اسے اسلام سے کیا تعلق تھا، تاریخ سے کتنا لگاؤ تھا، اس کا اندازہ اس نمرود والی حکایت سے ہو سکتا ہے۔ میں نے چاہا کہ ان کی قیام گاہ پر جا کر کسی وقت دریافت کروں کہ "مولانا، قرآن پاک میں تو نمرود کا نام کہیں نہیں آیا، پھر یہ نام آپ نے کہاں سے لیا اور جن روایات کی بنا پر یہ نام لیا جاتا ہے ان کی صحت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے، جبکہ جناب ابراہیم کا حمورابی کے عہد میں ہونا پایا جاتا ہے اور نمرود کے زمانہ کو اس عہد سے کوئی واسطہ نہیں" ——

یہ بھی دریافت کرنے کو جی چاہا کہ "اسلام میں جو روایات جناب ابراہیم کے متعلق پائی جاتی ہیں وہ کس حدتک توریت کے بیان سے علحدہ ہیں اور صحف موسیٰ (Pentateuch.) اور یہودیوں کی کتاب مِرداش رباؔ میں جو حالات جناب ابراہیم کے دیئے ہیں، کلام مجید کس حدتک ان کا مصدّق و منکر ہے۔ لیکن یہ سمجھ کر کہ اس گفتگو کا کوئی نتیجہ نہ ہوگا خاموش رہا اور ہندوستان کے جہل کو دعا دینے لگا جس کے بدولت اتنے لوگوں کا پیٹ چل رہا ہے۔

اس سے قبل فقر و درویشی اور علم و فضل پر ایک ایسا دور آ چکا ہے جب وہ دنیاوی جاہ و ثروت کو کمال بے نیازی کے ساتھ ٹھکرا دیتا تھا اور بڑے بڑے امرار و سلاطین کو بھی ان کی بوریا نشینی تک باریاب ہونے کا موقع نہ ملتا تھا۔ لیکن اگر آپ کو اس تصویر کا دوسرا رُخ دیکھنا ہو تو حیدرآباد چلے جایئے اور دیکھئے کہ کیسا کیسا مدعی فضل و کمال، کیسا کیسا صوفی و"مشائخ" امرار کے دربار میں سائلانہ انداز سے پہونچتا ہے اور کس طرح تملق و چاپلوسی سے کام لیکر دین و مذہب کا سودا کرتا ہے —— وہی عالم و صوفی، وہی رہبر مذہب و طریقت جس سے اگر آپ اس کے مدرسہ و خانقاہ میں ملنے جائیں تو یہ ظاہر ہو کہ شاید یہ کوئی دوسرا خدا ہے جو انتہائی کبر و نخوت کے ساتھ تخت خدائی پر متمکن ہے۔ ہاں وہی عالم و صوفی، آپ کو معلوم ہے کہ حیدرآباد کے کسی امیر کی محفل میں پہونچکر کیا چیز ہو جاتا ہے ——

یہ خدا یہاں پہونچکر ایسا ذلیل بندہ بنجاتا ہے کہ شاید ہی اس سے زیادہ کوئی "کمینہ چاکر" دنیا میں پایا جائے اور یہ فرعون یہاں درباریوں کی صف میں پہونچکر اس درجہ بجوج، اس قدر "خاکسار و فدوی" نظر آتا ہے گویا کہ وہ غلامان زورق[1] (Galley Slaves) میں سے کوئی مصیبت زدہ غلام ہے۔ غالباً اس کے اظہار کی ضرورت نہیں کہ ان حضرات کی یہ ایکٹنگ (تمثیل) کس مدعا کو لئے ہوئے ہوتی ہے —— اگر آپ کاغذات سرکاری دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو سکتا ہے کہ کتنے ماہانہ وظائف و سالانہ عطیات ان حضرات کو ملتے ہیں اور یہ اپنے اعزہ و متوسلین کے لئے ملازمتیں حاصل کرنے میں کس قدر کامیاب ہوتے ہیں ——

---

[1] یوروپ میں سولھویں اور سترھویں صدی کے اندر رواج تھا کہ اسیران جنگ، یا اور دوسرے غلاموں سے کشتی رانی کا کام لیتے تھے۔ یہ غلام زنجیروں سے بندھے بندھے کشتیاں چلاتے تھے اور نہایت سخت تکالیف میں مبتلا کئے جاتے تھے "Galley." اس کشتی کا نام تھا جہاں وہ کام کرتے تھے۔ اس لئے اس کا ترجمہ "غلامان زورق" کیا گیا۔ (زورق بہ معنی کشتی)۔

میرا قیام بدستور مولانا ہوش بلگرامی کے بنگلہ پر رہا اُن کے خلوص و کرم کی داستان چھیڑنے کی ضرورت نہیں کہ وہاں تو جو کچھ ہے میرا ہے - لیکن اس مرتبہ ان کی وساطت سے ایک ایسی نعمت غیر مترقبہ مجھے ملی کہ اس کا ذکر نہ کرنا غالباً کفران نعمت ہوگا - یہ تو ہر بار سفر حیدرآباد کے سلسلہ میں کسی نہ کسی قابل ذکر ہستی سے ملاقات ہو جاتی ہے، لیکن اس مرتبہ ایسی ذات گرامی سے اُنھوں نے تعارف کرایا کہ آخر کار میں ان تمام تکلیف دہ مناظر کو جن کا ذکر ابھی ابھی کر چکا ہوں، بھلا دینے پر مجبور ہو ہی گیا - یعنی ——— راجہ نارائن پرشاد صاحب بہادر -

آپ صدر اعظم بہادر کے حقیقی بھانجے ہیں اور بیگم پیٹ میں جو بلدۂ حیدرآباد سے دور چھاؤنی سکندرآباد کے علاقہ میں واقع ہے، نہایت ہی خاموش و پُرلطف زندگی بسر کرتے ہیں - میں حیران ہوں کہ وہ شخص جس نے ثروت کی آغوش میں آنکھ کھولی ہو، جاہ و دولت کے گہوارہ میں پرورش پائی ہو، غلامانِ زریں کمر و کنیزانِ سیمن بر کے حلقہ میں جس کا نشو و نما ہوا ہو جس کو "جور استاد" کے مقابلہ میں "مہر پدر" سے زیادہ واسطہ پڑا ہو اور جسے ایک محدود و جماعت و مختصر سر زمین میں مدارج حیات بسر کرنے کی وجہ سے بہت کم موقع حیات انسانی کے مطالعہ کا ملا ہو - وہ کیونکر ایسا بہتر انسان بن سکتا ہے - سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ یہ نتیجہ ہے اُن کے خال محترم (سر مہاراجہ بہادر) کی صحیح تربیت کا اور خود راجہ صاحب کی فطری اہلیت کا جو "مجبور اکتساب" طبقہ کے لوگوں میں بھی بہت کم نظر آتی ہے، چہ جائیکہ طبقۂ امراء میں ——— سچ ہے - "این سعادت بزور بازو نیست" ———

راجہ صاحب کا پاکیزہ ذوق ادب فنون لطیفہ میں انکی بالغ نظری، وسعت مطالعہ کے ساتھ اُن کی نگاہ نقاد، ان حقیقتوں کا تھوڑا سا علم تو مجھے اول ہی دن اُن کی گفتگو سے ہو گیا تھا اور پھر اس کی تصدیق ان کی لائبریری کو دیکھ کر ہوئی جو ہر فن کی بہترین کتابوں سے آراستہ ہے، لیکن حق الیقین کا مرتبہ تو اس خنک چاندنی رات میں ہوا جب ان کی فطرت جمیل بالکل عریاں تھی ——— اور عریاں بھی بالکل اُس طرح جس کو کسی شاعر نے ایک خاص کیفیت کے ماتحت ان الفاظ میں ادا کیا ہے کہ :-

به بزم باده گریبان کشود دلش بنگرید
خوشا بهانهٔ مستی، خوشا رعایت شوق

درختوں سے چھن چھن کر آنے والی چاندنی، سرد ہواؤں کے ہلکے ہلکے جھونکے، دکن کی بھیگی ہوئی رات کا وہ لطیف نم (جیسے کوئی نہانے کے بعد کچھ خشک اور کچھ بھیگے ہوئے بال لئے ہوئے بازو پر سر رکھ کر لیٹ جائے) آبادی سے بہت دور، خاموش و پرسکون فضائیں، تین یک رنگ دلوں کا یکجا جمع ہو جانا ——— اور شعر و ادب یا کسی ملکہ شعر و ادب کا موضوع گفتگو قرار پانا - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید اب اس رات کی

صبح کبھی نہ ہوگی اور اگر ہوگی تو غالباً میر کی اس کیفیت کو لئے ہوئے کہ

القصہ نہ در پے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

راجہ صاحب نے جیسے جیسے لطیف اشعار فارسی اردو کے اس صحبت میں سنائے وہ قیام دکن کے زمانہ میں غالباً میرے اور ہوش دونوں کے لئے بالکل نئی چیز تھے ——— اے وقت تو خوش کہ وقت ماخوش کردی — بہرحال سرزمین دکن میں میرے لئے یہ ایک اور نئی وجہ کشش پیدا ہو گئی ہے اور منتظر ہوں کہ دیکھئے یہ لطیف صحبت پھر کب نصیب ہوتی ہے

———— - - - - - ————

غالباً ناشکری ہوگی اگر اس سلسلہ میں مولوی محمد میر خاں صاحب غربت' ام۔ اے کا ذکر نہ کروں جنھوں نے ایک شام مجھے مدعو کرکے لذت روحانی سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ دیا۔ غربت صاحب سے یوں تو میرے غائبانہ مراسم ایک زمانہ سے ہیں لیکن "مشاہدۂ ذات" کا موقع اسی مرتبہ ملا۔ آپ حیدر آباد میں اسسٹنٹ اکاونٹنٹ جنرل کے عہدہ پر ممتاز ہیں اور نہایت اچھا ذوق شعر و ادب کا رکھتے ہیں۔ آپ ہی کے وساطت سے ایک اور گرانمایہ ہستی ڈاکٹر طاہر صاحب سے شرف نیاز حاصل ہوا' آپ نظام کالج میں لاطینی اور فارسی زبان کے پروفیسر ہیں اور یوروپ سے اتنی زبانیں سیکھ کر آئے ہیں کہ اگر آپ کو برج بابل (Tower of Babel) کہا جائے تو ناموزوں نہ ہوگا۔ نہایت آزاد خیال۔ روشن فکر انسان ہیں اور موسیقی کا بھی اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ آپ نے متعدد بار میرے پاس آنے کی زحمت گوارا فرمائی' لیکن مجھ بدنصیب کو ایک بار بھی "بازدید" کا موقعہ نہ ملا خدا معلوم کیا کیا باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا۔ بہرحال "اگر فقیر دن کا پھیر ادھر کبھی ہوا تو غربت کے دولت کدہ پر ہو کر یہ حسرت بھی پوری کرونگا۔

۱۸ کی صبح کو جب ریل میں آنکھ کھلی تو سب سے پہلے میں نے اخبار کی جستجو کی تاکہ ۱۷ کا وہ اعلان حکومت دیکھوں جس میں فرقہ وارانہ نیابت کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ کانپور پہونچکر اخبار لیا اور نہایت بیتابی سے اس نقشہ کو دیکھنے لگا جس میں اقلیت و اکثریت کی نیابت کے اعداد و شمار دیے گئے تھے۔ یہ تو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ حکومت سوائے جداگانہ انتخاب کے کسی اور طریق کار کو پسند کر ہی نہیں سکتی، لیکن اس کا علم نہ تھا کہ یہ فیصلہ ہندو و مسلمان دونوں کے لئے اس درجہ ناقابل اطمینان ثابت ہوگا ——— اعلان میرے سامنے تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا ایک دل کے اس سے زیادہ ٹکڑے کرنا ممکن ہیں —

پنجاب کے سکھ اور ہندو نالاں ہیں کہ مسلمانوں کو بہت زیادہ حق نیابت دیا گیا، مسلمان کہہ رہے ہیں کہ ہماری کثرت آبادی کا بھی کافی لحاظ نہیں کیا گیا' یہی حال بنگال اور سرحدی صوبہ کا ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے کہ حق نیابت کے فیصلہ سے نہ وہ خوش ہیں نہ ہندو۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اقلیت ہے وہاں مسلمانوں کو وہی شکایتیں ہیں جو نیابت وغیرہ میں ہندوؤں کو ہیں، الغرض حیرت کا مقام ہے کہ یہ فیصلہ مسلمانوں میں نہ صرف حافظ ہدایت حسین صاحب

اور مولوی شفیع داؤدی کے لئے ناقابل اطمینان ثابت ہوا بلکہ حد یہ ہے کہ ڈاکٹر شفاعت احمد خان اور بیگم شاہنواز بھی زیادہ مطمئن نہیں۔ حکومت کو معلوم تھا اور وہ اس سے قبل اپنا خیال ظاہر کرچکی تھی کہ اس فیصلہ سے سب کو خوش کرنا ممکن نہیں، لیکن واقعی یہ ایک جدید انکشاف ہے کہ وہ کسی ایک کو بھی خوش نہ کرسکی۔ تاہم اب سوال یہ ہے کہ کیا اس کی ذمہ دار حکومت ہند ہے، کیا قابل الزام برٹش راج ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ جو کچھ خطا ہے وہ صرف ہماری ہے کہ ہم خود کوئی فیصلہ نہیں کرسکے اور مخلوط انتخاب کی امن پسند صورت کو چھوڑ کر جداگانہ انتخاب کا مطالبہ اختیار کیا جو کسی طرح کسی کو مطمئن نہیں کرسکتا —— ظاہر ہے کہ حکومت نے بالکل مجبور ہوکر یہ ذمہ داری اُس وقت اپنے سر لی جب تمام جماعتوں نے متفقہ طور پر کہدیا کہ وہ خود کوئی فیصلہ نہیں کرسکتیں۔ اس لئے اب شکوہ و شکایت بیکار ہے اور ہم کو یہ عذاب برداشت کرنا پڑیگا جس کو خود ہم نے مول لیا ہے۔ اعلان میں ظاہر کیا گیا ہے کہ اب بھی یہ فیصلہ حکومت کا منسوخ ہوسکتا ہے اگر اہل ہند کوئی متفقہ مطالبہ پیش کریں، لیکن ہمیں معلوم ہے کہ حکومت کی یہ انصاف پسندی اور جرأت اخلاق کس وثوق کی بنا پر ہے جس طرح مہاتما گاندھی نے سادہ کاغذ پر دستخط کرکے مسلمانوں سے کہدیا تھا کہ تم جس متفقہ فیصلہ کو پیش کروگے میں کانگریس کی طرف سے منظور کرونگا، بالکل اسی طرح حکومت کا یہ کہنا ہے۔ کیونکہ مہاتما گاندھی خوب واقف تھے کہ مسلمان ایسے معمولی احمق نہیں ہیں جو آپس کے اختلافات کو محو کرکے کسی ایک فیصلہ پر متفق ہوجائیں گے اور حکومت بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ ملک میں اب ہندو مسلمانوں کا کسی ایک امر پر اتفاق کرلینا آسان بات نہیں۔ بہرحال فیصلہ جو کچھ ہونا تھا ہوگیا اور انتخاب جداگانہ کی جو بلا ہندوستان پر نازل ہونیوالی تھی کم از کم مزید دس سال کے لئے مسلط ہوہی گئی۔ اس وقت تو نہیں لیکن مستقبل بتائیگا کہ اس سے ملک کے امن و سکون کو کس قدر آزار ہوچکا اور کس کس طرح گوشت سے ناخن جدا کیا گیا۔ ہندو مسلمانوں کے موجودہ ناخوشگوار تعلقات کا علم لوگوں کو ہوہی چکا ہے، اب سکھوں نے اپنا محاذ علیحدہ قائم کرلیا ہے اور کچھ زمانہ گزرتا ہے کہ آپ باہمی کشاکش کے خطرناک مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور شیر کو جو اس کا "حصہ" (Lion's Share.) ملنا چاہیے ملکر رہیگا۔ پایندہ باد حکومت برطانیہ۔

———————————

مسٹر راحت حسین صاحب علوی (سول لائن۔ بریلی) کی ایک نہایت دردانگیز تحریر اس مضمون کی موصول ہوئی کہ اُن کے ایک نہایت ہی عزیز دوست شفقت علی بی اے جولائی سنہ ء کے نگار میں، مجنوں گورکھپوری کے فسانہ "سمن پوش" پڑھ کر دفعۃً "قلب کی حرکت بند ہوجانے سے، رحلت کرگئے۔ مراسلہ نگار کا بیان ہے کہ مرحوم نہایت حساس طبیعت رکھتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ "یہ افسانہ میری جان لیکر چھوڑیگا" اور آخر کار وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ مرحوم نے موت سے کچھ دیر قبل افسانہ کے آخر میں سُرخ روشنائی سے بقید وقت و تاریخ یہ شعر لکھا تھا:-

ن خوں سینہ سے ہٹتا نہ یاد گل آتی[لہ]
عجب چیز تھی تیر جفا کی دلدوزی

میں نے مراسلہ نگار سے اس "شہید ادب" کے مفصل حالات زندگی طلب کئے ہیں اور اگر مل گئے تو وہ بھی ناظرین نگار کی خدمت میں پیش کردیئے جائیں گے

نیاز

———————————

لہ یہ شعر میری ایک قومی نظم کا ہے جو عرصہ ہوا کسی رسالہ میں شایع ہوئی تھی (نیاز)

فطرت اور انسان کی جنگ

انسانی آبادی کا عجیب و غریب معمہ

مسلسل

ہم معترضین کو، ان زمانوں کے لحاظ سے جن میں انھوں نے اعتراض کئے، تین گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:-

(۱) مالتھس کے ہم عصر اور ڈارون سے پہلے کے معترضین۔

(۲) ڈارون کے بعد اور جنگ عظیم سے قبل کے معترضین۔

(۳) جنگ عظیم کے بعد کے معترضین۔

مالتھس کے ہم عصر اور ڈارون سے پہلے کے معترضین

مالتھس کے ابتدائی معترضین میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ ان میں ماہر اقتصادیات بھی تھے اور کلیسا کے پادری بھی۔ مدبران سلطنت بھی تھے اور "طنزیات" کے لکھنے والے بھی۔ فلسفی بھی تھے اور شاعر بھی۔ ایلیسن نے ۱۸۳۷ء کے "اڈنبرا ریویو" میں، ان سب کو چند گروہوں میں جمع کر دیا ہے۔ سب سے اول تو وہ لوگ آتے ہیں جنھیں وہ خالص حمقا کے نام سے موسوم کرتا ہے اور جس میں امتیازی مرتبہ جمیس گرہم کو دیتا ہے۔ ان لوگوں نے مالتھس کے نظریہ کو غلط سمجھ کر اس پر مہمل اعتراضات کر ڈالے۔ گرہم کے خیال میں مالتھس کا عقیدہ، قحط کے متعلق یہ تھا کہ یہ قلت غذا کے مستقل مرض کا فطرت کی طرف سے نہایت پر محبت علاج ہے۔ دوسرا عقیدہ، مالتھس کا، اس کے نزدیک یہ تھا کہ فطرت، انسان کو سکھلاتی ہے کہ وہ امراض کو ایجاد کرے تاکہ آبادی حدود کے اندر رہے۔ اس کے علاوہ، اس نے معلوم کیا کہ مالتھس، بدکاری اور عصبیت کو، زاید از ضرورت آبادی کا مصلح سمجھتا ہے اور اُن کو روکنے کی جگہ، ترقی دینا چاہتا ہے۔ ان معترضین کو جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ بقول غالب:-

یارب، نہ وہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو، جو نہ دے مجھ کو زبان اور

دوسرا گروہ، ان معترضین کا ہے جن کے جذبات اور معتقدات کو مالتھس کے نظریہ آبادی سے صدمہ پہنچا۔ ایلیسن

تھے کالرج، بشپ ہنٹنگ فورڈ اور سر جان لینزلی - شامل ہیں - سر جان لینزلی نے یہ بات قرار واقعی طور پر ثابت کر دی کہ مالتھس، ملحد اور مرتد تھا - اس کے بعد، کسی مزید بحث و مباحثہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی جیسے آج کل، جس مخالف پر بس نہ چل سکے اُسے بالشوک کہہ دیا جاتا ہے - اور اس طرح گویا، تمام قضیہ ختم کر دیا جاتا ہے۔

تیسرا گروہ، ان لوگوں کا ہے جنھوں نے کہا کہ مالتھس نے کوئی نئی بات پیش نہیں کی - ایک بدیہی اور ناقابل انکار حقیقت کے بیان کرنے میں، بے کار، اپنا اور دوسروں کا وقت ضایع کیا - اس گروہ کے ممتاز معترضین، کالرج اور ہیزلٹ تھے - کالرج کہتا ہے کہ "ایک فلسفیانہ تصنیف کا سوائے اس کے کوئی مقصد نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے نظریہ کی تائید میں، ثبوت، دلائل اور نظائر فراہم کرے - اس کتاب میں بھی یہی کیا گیا ہے مگر طرفہ تماشہ یہ ہے کہ یہاں ایک مسلمہ بدیہی حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے ۳۵۰ صفحے سیاہ کئے گئے ہیں! اسے کہتے ہیں کتاب بنانا!

مگر اس قسم کے تمام اعتراضوں کا نہایت آسانی سے، ایک دوسرے سوال کی شکل میں جواب دیا جا سکتا ہے۔

ان محققین سے ہمیں دریافت کرنا چاہئے کہ آیا وہ کسی موجد، کسی ماہر سائنس، کسی فلسفی کی ایسی مثال پیش کر سکتے ہیں جس نے ایک بدیہی حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرانے سے زیادہ اہم، کبھی کوئی اور دوسرا کام انجام دیا ہو؟ اسکی دریافت کے بعد اسکی دریافت کی ہوئی حقیقت، بدیہی اور مسلم الثبوت ہو ہی جاتی ہے جسے ایک اسکول کا مبتدی بھی اتنے ہی وثوق کے ساتھ پیش کرتا ہے جتنا کہ ایک علامہ بے بدل. لیکن دریافت کے لمحے سے پہلے، عام آدمیوں کے لئے وہ اسی قدر تاریک اور لامعلوم ہوتی ہے جیسے کہ خود ان کے جسم کی اندرونی سطح۔

چوتھا گروہ، "تجربیئن" (Statistician) یعنی ان لوگوں کا ہے جن کا عقیدہ تھا کہ اصول آبادی ہر زمانہ میں، اختلاف حالات کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے - اس میں گاڈون، ہرالیس اور مورٹ شامل ہیں - قدرتی طور پر، گاڈون کو، جس کی کتاب "محقق"، مالتھس کے "نظریہ آبادی" کی محرک ہوئی، معترضین میں پیش پیش رہنا چاہئے تھا، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس کا اثر، مالتھس کی تصنیف پر اچھا پڑا - کیونکہ پہلے ایڈیشن میں جس انتہا پسندی سے کام لیا گیا تھا وہ دوسرے ایڈیشن میں باقی نہیں رہی - گاڈون نے اعتراض کرنے میں، نہایت متانت اور سنجیدگی سے کام لیا اور اس لحاظ سے اس نے مالتھس کی بھی بڑی تعریف کی کہ اس نے اپنے "نظریہ آبادی" میں ایک خالص متلاشی حقیقت کی طرح بحث و مباحثہ کیا ہے دلبرفورس کی طرح، ذاتیات پر حملہ کر کے گاڈون نے اپنے اعتراضات کو بیہودہ نہیں بنایا - دلبرفورس نے ہکسلے سے "ارتقا" کے متعلق بحث کے دوران میں دریافت کیا تھا کہ "حضرت کا سلسلۂ نسب اگر بقول خود، بندر سے ملتا ہے تو کیا جناب یہ بیان فرمانے کی زحمت فرمائیں گے کہ جناب کے دادا صاحب قبلہ بندر تھے یا دادی صاحبہ محترمہ!"

گاڈون کے اعتراضات کا مرکز، اضافہ آبادی کے "موانع" تھے - لیکن یہ "موانع" وہی تھے جو صرف پہلے

ایڈیشن میں شایع ہوئے تھے اور بعد کے ایڈیشنوں سے خارج کر دیئے گئے تھے - گاڈون کی نظر، ہمیشہ، نوع انسان کی ترقی و تکمیل کی طرف رہتی تھی۔ اسی لئے مالتھس سے اس نے سوال کیا کہ کیا نوع انسان کی اصلاح کی جتنی تجویزیں ہیں، سب کا انجام، ناکامی، روز ازل سے مقدر ہو چکا ہے؟ کیا حکومتیں، کثرت آبادی کی برائیوں کا علاج، جنگ میں شریک ہونے کے علاوہ، اور کچھ نہیں کر سکتیں؟ اور کیا ہمیں، بدکاری، مصیبت اور قبل از وقت موت کو صبر و سکون سے گوارا کرتے رہنا چاہیئے؟ اس کے بعد، گاڈون، اصلاح کے طور پر، انھیں "امتناعی موانع" کو پیش کرتا ہے جن پر اپنی تصنیف کے بعد کے ایڈیشنوں میں مالتھس نے بہت زور دیا ہے - گاڈون کہتا ہے کہ اصلاح کی عالمگیر حکومت کے زمانہ میں، عاقبت اندیشی اور عزت نفس کے تخیل، اس قدر ترقی پا جائیں گے کہ وہ قبل از وقت شادی اور ضرورت سے زیادہ اولاد کو روک دیں گے۔ مالتھس نے ان سب اعتراضات کا جواب دیا۔ لیکن ان جوابات سے زیادہ قابل لحاظ یہ امر ہے کہ اپنی تصانیف کے آئندہ ایڈیشنوں میں، اس نے ان اعتراضات سے بہت فائدے حاصل کئے اور عاقبت اندیشی کو جو اہمیت اس کے بعد کے ایڈیشنوں میں حاصل ہے وہ، سراسر انھیں اعتراضوں کا نتیجہ ہے۔

شیلے، اپنی تصنیف "بغاوت اسلام" (Revolt of Islam.) کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ عوام کی امیدوں کے احیاء کے لئے، یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ مالتھس نے اپنے بعد کے ایڈیشنوں میں اخلاقی ضبط کی غیر محدود حکومت کو تسلیم کیا ہے۔ اس کی اس رعایت سے، انسانی ترقی کے متعلق، ان غیر موافق نتائج کا ازالہ ہو گیا ہے جو اُس کے "نظریہ آبادی" سے پیدا ہوتے تھے اور اب اس کی تصنیف "گاڈون کے سیاسی انصاف" کیلئے ایک شرح و تفسیر کا مرتبہ رکھتی ہے۔"

جس طرح گاڈون کے اعتراضوں کا اثر مالتھس پر اچھا ثابت ہوا، اسی طرح، مالتھس کے اعتراضوں کا اثر گاڈون پر بھی ہوا۔ پہلے گاڈون، آبادی کی ضرورت سے زیادہ توسیع کو، ایک خیالی اور وہمی چیز سمجھتا تھا۔ لیکن بعد کو جیسا کہ اس کی تحریروں (مثلاً تخیلات) سے ثابت ہوتا ہے وہ مالتھس کے بعد کے خیالات کا بڑی حد تک ہمنوا ہو گیا تھا۔

پانچواں گروہ معترضین کا وہ تھا جنھوں نے، اضافہ آبادی کے متعلق اپنے نظریہ خود بنائے مثلاً انڈرسن، اوون، اور پاؤلٹ اسکروپ - اسی ذیل میں - ایم - ٹی - سیڈلر، ممبر پارلیمنٹ، آرچی بالڈ ایلیسن اور ٹامس ڈبل ڈے بھی آتے ہیں۔ ایم - ٹی سیڈلر نے، مالتھس کے خیالات کے متعلق، یہ کہنے کے بعد کہ وہ اس قدر "ہولناک" ہیں کہ انکی نظیر، دنیا کے کسی اخلاقی ادب میں چاہے وہ متبرک ہو یا غیر متبرک نہیں ملتی"۔ اپنے نئے قانون آبادی کی اس طرح توضیح کی کہ "انسانوں کی (اگر وہ تمام دیگر اعتبارات سے ایک دوسرے سے مشابہ ہوں) اولاد پیدا کرنے کی اہلیت میں تبدیلی، ان کی تعداد کے بالکل برعکس ہوتی رہتی ہے" یعنی اگر اولاد کثیر ہے تو اولاد پیدا کرنے کی اہلیت کم ہو گی اور اگر اولاد کم ہے تو یہ اہلیت زیادہ ہو گی۔ اس کے دس سال بعد، آرچی بالڈ ایلیسن نے اپنا نظریہ پیش کیا اور اس کیلئے

دو جلدیں وقف کیں۔ نظریہ یہ تھا کہ "آبادی میں اضافہ کی مقدار، اُس کے حجم کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔" اس کے دس سال بعد، تھامس ڈبل ڈے نے اپنا نظریہ پیش کیا کہ "آبادی میں اضافہ، خوراک کی رسد کے بالکل مطابق ہوتا ہے" چھٹے گروہ میں وہ لوگ شامل ہیں، جنھیں ایمپین، غیر معمولی حد تک ضدی اور کج بحث قرار دیتا ہے اور جن کے متعلق کہتا ہے کہ انھوں نے مالتھس کے مقدمات اور نتائج دونوں سے انکار کیا۔ اور اس میں وہ۔ وے لینڈ کو رکھتا ہے۔ وے لینڈ کہتا ہے کہ اُن تمام مدارج و منازل میں، جن سے ہیئت اجتماعی گذرتی ہے، آبادی کا فطری میلان یہ ہوتا ہے کہ وہ ان حدود کے اندر رہے جو زمین کی "اہلیت پیداوار غذا" مقرر کرتی ہے۔" اسے دوسرے الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ "ہر آدمی کا جو قید خانہ کی چہار دیواری میں بند ہو، یہ فطری میلان ہوتا ہے کہ وہ قید خانہ کی حدود کے اندر رہے" مالتھس نے اس کا جواب یہ دیا کہ اگر یہ نظریہ صحیح ہے تو ہمیں اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے کہ ناروے کے گھنے جنگل میں، چیڑ کے درختوں کا میلان، اپنے تنے کے دونوں جانب شاخیں نکالنے کی طرف نہیں ہوتا لیکن یہ ہر شخص جانتا ہے کہ ناروے کے چیڑ کا درخت جو ایک کھلی ہوئی جگہ پر کھڑا ہوتا ہے، اپنی پھنگل سے لیکر جڑ کے قریب تک خوب پھیلی ہوئی شاخیں نکالتا رہتا ہے۔"

آخر میں ایمپسن، ان معترضین کا گروہ بناتا ہے جو اپنے آپ کو عملی آدمی کہتے ہیں اور اس میں وہ آرتھر ینگ کو شامل کرتا ہے اور اس کے اعتراض دیکھکر یہ کہنا پڑتا ہے کہ جہاں عالم کو پہنچنے کی جسارت نہیں ہوتی۔ وہاں جاہل کو بے دھڑک کو دنے سے کوئی شخص باز نہیں رکھ سکتا۔

یہاں تک تو ڈارون سے پہلے جو معترضین ہوئے اُن کا بیان کیا گیا۔ اب ہم ڈارون کے بعد کے معترضین کا ذکر کرتے ہیں۔

---

(۲) ڈارون کے بعد اور جنگ عظیم سے پہلے کے معترضین

ان میں سب سے اول جو لوگ قابل ذکر ہیں وہ "اشتراکیین" یا سوشلسٹ ہیں۔ سوشلسٹ جماعت میں جو لوگ زیادہ غور و فکر کرنے والے ہیں وہ مالتھس کی سرے سے تردید کرتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بعض میں اس قدر لچک ضرور رہی ہے کہ وہ اپنی اسکیموں میں، اولاد کی پیداوار کو محدود کرنے کے ان ذرائع کو جو جدید مالتھیسیوں (Neo-Malthusianism.) نے تبلائے ہیں، شامل کر لیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سوشلزم اور مالتھس کے ابتدائی نظریہ میں، کوئی مغاہمت نہیں ہو سکتی۔ اگر نوع انسان، تمام دیگر انواع حیوانات کی طرح حیات کے ناقابل عبور حدود سے برابر ٹکراتی رہتی ہے تو ان حدود کو سوشلزم یا کسی اور دوسری اصلاحی تجویز

کے ذریعہ سے، تھوڑا اسے آگے سرکا دینے یا ان میں تکیہ اور گدا لگا دینے سے تاکہ چوٹ زیادہ سخت نہ آئے، کام نہیں چل سکتا۔ اور ان تدبیروں کا اثر ان کی انتہائی کامیابی کی حالت میں بھی محض عارضی ہو سکتا ہے۔ ان تمام باتوں کو محسوس کرنے کے بعد مارکس اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا تھا۔

نئی مشین، برابر مزدوروں کی جگہ لیتی جا رہی ہے اور اس کی کوئی تلافی، فوراً یا کچھ عرصہ کے بعد، طلب کا اضافہ کر کے نہیں کرتی ہے۔ مشینری کے مقابلہ میں، اس خزانہ میں، جس سے مزدوروں کی اُجرت ادا کی جاتی ہے، اضافہ، نسبتاً کم ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ ایک ایسی آبادی کی تعداد برابر بڑھتی جائے گی جو سرمایہ کی مقدار کے مقابلہ میں زاید از ضرورت ہوتی ہے اور ضرورت سے زیادہ آبادی کے پیچیدہ مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ موجودہ تنظیم صنعت کی یہ ستم ظریفی دیدنی ہے کہ جو سبب، ملک کی مجموعی پیداوار اور آمدنی میں اضافہ کرتا ہے وہی سبب بیک وقت، آبادی کو زاید از ضرورت قرار دیتا ہے اور مزدوروں کی حالت کو سقیم کر دیتا ہے۔ مگر سرمایہ دار اس زائد از ضرورت آبادی کے وجود پر تاسف نہیں کرتے بلکہ خوش ہوتے ہیں کہ اس طرح ہمارے مزدوروں کی فوج کا ایک محفوظ دستہ تیار ہو رہا ہے جو، کم اُجرت پر، ضرورت کے وقت ہمارا کام کرنے کے لئے آمادہ کیا جا سکے گا۔"

سوشلسٹ، اس چکر میں ہے کہ ایک طرف تو وہ مزدوروں کی مصیبت اور بے چارگی کو ثابت کرے اور دوسری طرف اس کا تمام الزام، سرمایہ داری کی مشین پر عائد کر دے ——————

—————— اس لئے آبادی کے زاید از ضرورت پھیلاؤ سے جتنی تشریحیں، موجودہ مصیبت اور تباہی کی کی جاتی ہیں، ان سے وہ حتی الوسع، اجتناب اور اعراض کرنا چاہتا ہے۔

ہنری جارج نے، اپنی کتاب "ترقی اور افلاس" میں مالتھس پر بہت جھنجھلاتے ہوئے اعتراض کئے ہیں۔ مگر اسکے اعتراضوں میں کوئی جدت نہیں ہے۔ اُس سے پیشتر، گاڈون اور سیڈلر، اسی قسم کے اعتراضات کر چکے تھے۔ ہنری جارج کا یہ کہنا ہے کہ زائد از ضرورت تعداد، فطرت کی غلط حساب دانی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ انسانی خراب اداروں اور ناقص حکومت کا لایا ہوا عذاب ہے۔ ہنری جارج کی رائے میں، مالتھس، ایک دیوانہ وار بڑھتی ہوئی آبادی کے تخیل میں اس قدر کھویا جاتا ہے کہ آبادی میں جو فی الحقیقت اضافہ ہوا ہے اُسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ یہ اضافہ عام طور پر ان حدود کے مقابلہ میں جو فطرت نے مقرر کر دیئے ہیں، بہت کم ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ اگر کوئی ایسا قانون آبادی کا ہوتا جیسا کہ مالتھس نے پیش کیا ہے تو اسے مالتھس سے بہت عرصہ پہلے دنیا نے تسلیم کر لیا ہوتا۔ علاوہ ازیں، آبادی کے اضافہ کے ساتھ ساتھ، غذا میں اضافہ کافی مقدار میں ہوتا رہتا ہے۔ کیونکہ اضافہ آبادی سے جو جدید تقسیم عمل پیدا ہوتی ہے اس کے سبب سے

آدمی، اپنے معمولی خرچ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے لگتا ہے۔ اور مشاہدہ ہمیں بتلاتا ہے کہ جو ملک جس قدر زیادہ آباد ہے اسی قدر زیادہ دولتمند ہے۔ مگر جارج کے اس تمام بیان کو ہم اُسی حد تک صحیح کہہ سکتے ہیں جس حد تک تقسیم عمل اور دوسری ایجادوں سے، دولت کی پیداوار میں، تیزی کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس حقیقت سے جارج یا اس کا کوئی اور حمایتی، انکار نہیں کر سکتا کہ انسان کی اولاد پیدا کرنے کی اہلیت اور اس کے حرص و آز کا میلان ہمیشہ حدود سے متجاوز ہونے کی طرف رہتا ہے۔ آدمی، دولت بھی پیدا کرتا ہے اور اپنی نسل بھی۔ مگر انسانوں اور ان کی احتیاجات میں اضافہ، دولت کی پیداوار کے مقابلہ میں زیادہ سرعت کے ساتھ ہوتا رہتا ہے۔

لیکن ہنری جارج کے ایک اعتراض کی تردید آسانی سے نہیں کی جا سکتی۔ وہ کہتا ہے کہ آبادی کی ترقی، معیار حیات کے بلند ہو جانے سے گھٹ جاتی ہے۔ مالتھس نے یہ نہیں سمجھا کہ اس کے "اجباری" اور "امتناعی" "موانع" کے علاوہ، آبادی کی ترقی روکنے کا ایک تیسرا سبب بھی پیدا ہو سکتا ہے، جو معیار راحت کے بلند ہو جانے سے پیدا ہوتا ہے۔ مگر اس جگہ ہنری جارج آبادی کے "موانع" کی ضرورت تسلیم کر کے، مالتھس کا طرفدار ہو جاتا ہے اس کے بعد، ہنری جارج، ایک پرانی انگریزی ضرب المثل کو اپنی کتاب میں درج کرتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ امراء کے لئے ان کی خوش قسمتی اور غرباء کے لئے ان کی اولاد اور اس سلسلہ میں آڈم اسمتھ کی وساطت سے اسکاٹ لینڈ کی ایسی عورتوں کا تذکرہ کرتا ہے جن کا وجود وہاں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں سمجھا جاتا، جو باوجود نیم گرسنگی تیئیس ۲۳ چوبیس ۲۴ بچوں کی ماں ہوتی ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ افلاس سے "اہلیت پیداوار اولاد" کم نہیں ہوتی۔ پھر وہ اس قانون کو پیش کرتا ہے جسے وہ اصلی قانون، اضافہ آبادی کا سمجھتا ہے:۔

اضافہ کی طرف میلان، ہر جگہ یکساں ہونے کی بجائے، ان جگہوں پر زیادہ طاقتور ہوتا ہے جہاں ایک کثیر آبادی کے ذریعہ سے آرام کے زیادہ امکانات پیدا ہو جاتے ہیں اور جہاں نسل کے دوام کو، ناموافق حالات کی بنا پر، کثرت اموات کی وجہ سے، معدوم ہو جانے کا خدشہ لگا رہتا ہے۔ لیکن یہ میلان کم زور ہو جاتا ہے جب افراد کی اعلیٰ ترقی کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں اور نسل کا دوام یقینی ہو جاتا ہے"۔

راسخ العقیدہ ماہران اقتصادیات نے، رکارڈو سے لیکر جیونس تک، برابر مالتھس کو حرف بہ حرف قبول کیا لیکن جو نظریے آبادی کے متعلق، بعد کے ماہران اقتصادیات نے پیش کئے وہ مالتھس کے خیالات سے مختلف تھے۔ علاوہ ازیں ان کے خیالات، اس قدر ایک دوسرے سے مشترک ہیں کہ ہم انھیں یکجائی طور پر "متضادیین" کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ ان لوگوں نے انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز کے زمانہ میں اپنی تصانیف مرتب کیں۔ اس لئے انھوں نے کہا کہ مالتھس کے نتائج اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق صحیح تھے مگر دولت کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے اس کے اصول کو اپنی تیز رو میں بہا ڈالا ہے۔ صنعت و تجارت کو ہر جگہ فتح حاصل

ہوگئی ہے۔ مشینری اور نئی صدی کے دوسرے کارناموں نے، انسانی زندگی کو بہتر بنانے کے اس قدر مواقع پیدا کردیئے ہیں کہ اب کشمکش حیات کا بوجھ بالکل محسوس نہ ہونا چاہیئے۔ ہم ان لوگوں کا تذکرہ فرداً فرداً کرتے ہیں۔

پنسلوانیا یونیورسٹی کے پروفیسر پیٹن (Patten) نے اپنی کتاب "تہذیب کی نئی بنیاد" میں اپنے عہد کی صنعتی زندگی کو دیکھکر مستقبل کے لئے بہت خوشگوار پیشین گوئیاں کیں۔ امریکہ میں، نئی صدی کا خیر مقدم، جن متفاول جذبات کے ساتھ کیا گیا تھا اُس کا عکس پوری طرح اس کی تصنیف میں نظر آتا ہے۔ پھر یہ تفاول، امریکہ کے صرف ایک صوبہ تک ہی محدود نہ رہا۔ بلکہ اس کی صدائے بازگشت، کمی یا بیشی کے ساتھ انگلستان میں پروفیسر مارشل، سوئڈن میں پروفیسر کیسل، ہالینڈ میں ڈاکٹر پیرسن، فرانس میں، پروفیسر لیوا سیور اور اٹلی میں سینیر نٹی کی تصانیف میں سنائی دیتی ہے۔ مختصر یہ کہ بیسویں صدی کے آغاز کے وقت یہ صدا مہذب دنیا کے گوشہ گوشہ میں سنائی دیتی ہے۔ کیمبرج کے پروفیسر رائٹ کے الفاظ میں ہم اس وقت کی حالت کا نقشہ اس طرح کھینچ سکتے ہیں :-

"معیار حیات، مائل بہ ترقی تھا۔ اسباب حیات کی قیمتیں، زوال پذیر تھیں۔ انسان کی فتح، فطرت پر، مکمل معلوم ہوتی تھی۔ اسوقت مغربی یورپ میں، باوجود مل اور جیونس کی انتباہی آوازوں کے، نسل انسان کی مادی اور روحانی تکمیل کے متعلق، عام طور پر سب لوگ کامل ایمان رکھتے تھے۔ مالتھس اور اُس کا "نظریۂ آبادی" رکارڈو اور اُس کا "قانون تقلیل حاصل" دونوں بدنام اور متروک ہوچکے تھے"۔

پروفیسر آر۔ ٹی۔ الائی کا خیال ہے کہ گو یہ صحیح ہے کہ آبادی جب کبھی اُسے موقع ملتا ہے بڑھ جاتی ہے مگر مالتھس کا نظریہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ جس تیزی سے دولت میں اضافہ ہوا ہے آبادی میں اضافہ نہیں ہوا۔ سرمایہ داری اور جدید صنعت نے دنیا میں ایک مشین سے بنی ہوئی جنت کو پیدا کردیا ہے۔ لیکن آگے چل کر وہ کہتا ہے کہ آبادی میں اضافہ، دولت کے اضافہ کے مطابق اور معیار حیات کی ترقی کے برعکس ہوتا ہے۔ یعنی دولت کے اضافہ کا تو یہ تقاضا ہوتا ہے کہ آبادی کو بڑھایا جائے مگر معیار حیات میں اگر ترقی ہوجائے تو آبادی کا بڑھنا لازمی نہیں ہے۔ اخیر میں وہ یہ کہتا ہے کہ "اگر گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں آبادی میں اضافہ نہ ہوا ہوتا تو مزدوروں کی اہلیت پیدا وار میں آج بہت اضافہ نظر آتا اور اسی نسبت سے ان کی اجرت بھی بڑھی ہوئی ہوتی"۔

پروفیسر ایف۔ ڈبلو۔ ٹاسگ، مالتھس کے اصول کو انتہائی شکل میں پیش کرنے کے بعد، اُسے مسترد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر فی الحقیقت وہ آگے چل کر، اپنے تمام دیگر ہم عصر اقتصادئین کے مقابلہ میں، مالتھس کے اصول کے بہت نزدیک پہنچ جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اولاد کے روکنے کی کوششوں سے، جو سب سے پہلے مہذب جماعتوں میں اپنا عمل شروع کرتی ہیں اور اولاد کی کمی اور نسل کی کمزوری کا سبب ہوتی ہیں وہ ضرور خائف معلوم ہوتا ہے

لیکن اُس کا خیال ہے کہ اگر "عنان گیری ولادت" (Birth Control) کا اصول رفتہ رفتہ پھیلایا جائے تو اس سے آبادی پر اس درجہ قدرت حاصل ہو جائیگی کہ افلاس، مصیبت اور بدکاری مائل بہ فنا ہو جائیں گے۔

پیٹن، الائی، ٹاسگ، سلیگمین اور دوسرے امریکن اقتصادیین سب اس بات پر متفق ہیں کہ موجودہ تہذیب کی مشین نے، انسان کو اس بلند سطح پر پہنچا دیا ہے جہاں آبادی میں تبدیلیاں، مالتھس کے اصول کے مطابق نہیں ہوتیں۔

برطانوی اقتصادیین کا سردار، پروفیسر مارشل کہتا ہے کہ "جدید مشنیری نے، انسان کے کاندھے سے، مالتھس کے اصول کا بوجھل جُوا، اتار کر پھینک دیا ہے۔ انیسویں صدی کے شروع نصف میں، انگلستان کے اقتصادیین کا اضافۂ آبادی کے متعلق یہ عقیدہ تھا کہ اس کا میلان ہمیشہ ذرائع حیات سے متجاوز ہو جانے کی طرف رہتا ہے ان کا یہ بیان مبالغہ سے پُر تھا۔ لیکن اس کے لئے، ہمیں مالتھس کو معذور سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ اگر وہ خشکی اور سمندر کے دُخانی ذرائع آمد و رفت کی اُن ترقیوں کو، جن کی وجہ سے موجودہ نسل کے انگریز، دنیا کے زرخیز ترین ممالک کی پیداوار کو، نہایت کم صرف کے ساتھ اپنے ملک میں حاصل کر سکتے ہیں، سمجھنے سے قاصر رہا۔ تو یہ اس کا قصور نہ تھا۔ یہاں تک تو مارشل ابتدائی بیسویں صدی میں جو تفاول کی لہر جاری تھی اس سے پوری طرح متاثر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ ٹاسگ کی طرح، اپنے بیان میں تھوڑی ترمیم کرتا ہے۔ ٹاسگ کا تو یہ خیال تھا کہ مالتھس کا اصول صرف ان لوگوں کی حالت پر منطبق کیا جا سکتا ہے جو گرسنگی کی سطح پر ہوتے ہیں مگر ان لوگوں میں جو زیادہ خوش قسمت ہوتے ہیں، اس کا عمل محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن مارشل کا یہ خیال ہے کہ اس اصول کا اطلاق، صرف غیر مہذب توموں پر ہو سکتا ہے اور مغربی مہذب اقوام، اس کے عمل سے محفوظ ہیں۔ جیسے جیسے مادی راحت و آرام کے مغربی معیار، اقتصادی حیثیت سے پست اقوام میں پھیلیں گے، ان اقوام کی آبادیوں کی تعداد گھٹتی رہیگی اور اگر اُن کی آبادیاں برابر بڑھتی رہیں تو وہ کبھی مغربی معیار حیات تک نہ پہنچ سکیں گی۔

ایم۔ سیواسیر، فرانسیسی متفاول اقتصادیین میں سے ہے۔ مشنری اور بجلی کی قوت کی سحر کاریوں سے متاثر ہو کر، وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ رکارڈو کے "نظریہ تقلیل حاصل" پر، موجودہ حالات کی روشنی میں، نظر ثانی کی ضرورت ہو گئی ہے۔ بلکہ مشین اور بجلی نے اُس کو بالکل متروک کر دیا ہے۔ سائنس اور اس کے نئے علم الکیمیا، المونیم اور دریا کے مد و جزر سے فوائد حاصل کرنے کے امکانات نے، نسل انسان کے لئے، ایک غیر محدود مدت کے لئے اچھی زندگی کے امکانات کو بالکل یقینی کر دیا ہے۔ اُس کی تصنیف میں امریکہ کی متفاول

فلسفہ کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔
اسٹاک ہوم یونیورسٹی کے پروفیسر کیسل نے اپنی پوری کتاب "سوشل اکانمی" میں، ایک لفظ بھی مسئلہ آبادی اور مالتھس کے متعلق نہیں لکھا ہے۔ مگر پروفیسر کیسل قدیم تجارتیین (Mercantilists) کا ہم خیال معلوم ہوتا ہے اور کثرت آبادی کو اضافہ دولت پر منحصر نہیں سمجھتا بلکہ اضافہ دولت کو خود کثرت آبادی کا نتیجہ باور کرتا ہے۔ لیکن بعد میں، ریکارڈو کے "نظریہ لگان" اور اجرت کے آہنی قانون" کا تذکرہ کرتے ہوئے مالتھس کی تجویز سے پوری ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

اٹلی کے ماہر اقتصادیات مدبر، الیف۔ ایس نٹی کے تفاؤل میں، اعتدال نظر آتا ہے۔ مختصر الفاظ میں اس کا نظریہ یہ ہے کہ انسانوں میں اضافہ آبادی، بالکل ذرائع حیات کے مطابق ہوتا ہے۔ نٹی کا عقیدہ ہے کہ آبادی کا دباؤ، اسباب حیات پر تقسیم دولت سے عوام کے مستفید ہونے، منڈیوں کے بین الاقوامی ہو جانے اور انسانوں کی اولاد پیدا کرنے کی قوت میں فطری طور پر کمی پیدا ہو جانے سے، بہت کم ہوگیا ہے۔

پروفیسر جیڈ کا بھی نٹی اور اسپنسر کی طرح یہ خیال ہے کہ تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ، انسان کی اولاد پیدا کرنے کی اہلیت میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ ایک حقیقی حیاتیاتی تبدیلی انسانی اعضا میں، رونما ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اولاد کی تعداد محدود ہو جاتی ہے اور مالتھس کے نظریہ اضافہ آبادی کی تردید ہو جاتی ہے۔ یورپین اور امریکن اقتصادیین میں یہی چیز مابہ الامتیاز ہے۔ یورپین اقتصادیین، حیاتیاتی تبدیلی پر زور دیتے ہیں اور امریکن محض اقتصادی امور کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ لیکن دونوں اپنے نتایج میں تفاؤل سے کام لیتے ہیں۔

ہالینڈ کا ڈاکٹر پیرسن، ایک دوسرے ماہر اقتصادیات لیرائے بولیو کی طرح، نیو مالتھیوزم یعنی طریقہ ہائے مانع اولاد کا حامی معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جنسی جذبات کو ضبط کرنا ممکن نہیں ہے۔ اسلئے مانع اولاد ذرائع کا استعمال کرنا چاہیئے۔ اس کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ اگر مزدور پیشہ لوگ، متمول لوگوں کی سطح پر، کسی تدبیر سے لے آئے جائیں تو ان میں صغر سنی کی شادیوں اور اولاد کی کثرت کا تدارک ہو جائے۔ مگر چونکہ کمسنی کی شادی اور کثرت اولاد کے تدارک سے ہی ان کی حالت بہتر بنائی جا سکتی ہے اس لئے جس نتیجہ کو ہم حاصل کرنا چاہ رہے ہیں، اُسے سبب کیسے بنا سکتے ہیں۔ اور معیار حیات کی بلندی کا مانع، مزدور پیشہ جماعت کی موجودہ حالت میں کس طرح قابل عمل ہو سکتا ہے۔ جو چیز اس وقت موثر ثابت ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اخلاقی ضبط اور مانع اولاد طریقوں کو مزدور پیشہ جماعت میں عام طور پر پھیلایا جائے اخلاقی ضبط، تجرد کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن جو قوت، دو مختلف جنسوں کو ایک دوسرے کی طرف کھینچتی ہے وہ عام طور پر، (رذیل خواہشات اور جذبات سے قطع نظر کر کے) اس قدر شدید ہوتی ہے کہ کسی قسم کا وعظ و پند اس کے دبانے میں کامیاب

نہیں ہو سکتا۔ شادی کی لذتوں سے صرف اس لئے کنارہ کش ہو جانا کہ اس میں اندیشہ، اولاد کی کثرت کا ہے جس کی وجہ سے معیار حیات کو پست کرنا پڑے گا، مہذب اور شائستہ لوگوں کے ہی امکان میں ہے مگر عام لوگوں کے لئے زیادہ تر نیو مالتھیوزم کے اصول ہی مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ تجرد کی تعلیم نہیں دیتے اور نہ ضبط نفس کے لئے لوگوں کو بہت زیادہ مجبور کرتے ہیں۔ اسی کے فوائد جاہل ترین آدمی سمجھ سکتا ہے کیونکہ اس سے خاندان کی تعداد میں وہ اضافہ رک جاتا ہے جس سے شادی کے چند دن بعد سے ہی میاں بیوی دونوں کی زندگی کی مسرتیں ضائع ہونے لگتی ہیں۔

جنگ عظیم سے پہلے کے اقتصادیین کے اعتراضات اور نظریے ہم یہاں ختم کرتے ہیں اور اب جنگ عظیم کے بعد کے اقتصادیین کے نظریے پیش کرتے ہیں۔

جنگ عظیم کے بعد کے اقتصادیین کے اعتراضات اور نظریے

جنگ عظیم کے بعد جن لوگوں نے اعتراضات اور نظریے پیش کئے اُن میں متداول فلسفی کم، اور تشائم زیادہ ہیں۔ تشائم فلسفیوں میں سب سے زیادہ اہمیت، پروفیسر ای۔ ایم۔ ایسٹ کو حاصل ہے۔ یہ مالتھس کا مکمل ہیرو معلوم ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی بعض باتوں میں بڑھا ہوا ہے۔ غذا کی مقدار کو 'ایسٹ' اضافہ آبادی کے لئے، نہ صرف آخری مانع باور کرتا ہے بلکہ اُسے ابتدائی اور فوری مانع کا مرتبہ دیتا ہے۔ اس کے نزدیک زمین کی تمام خالی جگہیں پُر ہوتی جارہی ہیں اور قابل کاشت زمین سے انتہائی پیداوار حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔ علاوہ ازیں اس کا یہ خیال ہے کہ انسانی فطرت میں، اس وقت بھی کوئی تبدیلی پیدا ہونے کی امید نہیں ہے جب دنیا کی تمام زمینوں سے انتہائی پیداوار حاصل کی جانے لگے گی۔ زندہ اور باقی رہنے کی کشاکش، یہ ہو سکتا ہے کہ ایک حد تک اعلیٰ اور ارفع شکل اختیار کرے مگر ہر چیز کی قربانی کر کے، زندہ رہنے کی جو تمنا ہے وہ انسان کی ابتدائی خصوصیت ہے اور جوں جوں مشکلات کا زیادہ مقابلہ کرنا پڑے گا، اسی قدر یہ تمنا تیز تر ہوتی جائیگی۔ بدترین شکلوں میں، اس کی وجہ سے، گذشتہ جنگ عظیم جیسی کوئی ہولناک مصیبت دنیا پر نازل ہوگی ورنہ یہ اقتصادی کشاکش کی صورت میں، برابر دنیا پر مسلط رہیگی اور نتائج کے اعتبار سے اتنی ہی مہلک ہوگی جتنی کہ گذشتہ جنگ عظیم

اس قدر بیان کرنے کے بعد، پروفیسر ایسٹ، اس مرض کا علاج تجویز کرتا ہو لیکن علاج تجویز کرنے میں وہ مالتھس سے اختلاف کرتا ہے۔ وہ مکمل طور پر "ولادت کی عناں گیری" کا حامی ہے۔ اور کہتا ہے کہ زائد از ضرورت آبادی سے نجات اسی صورت میں مل سکتی ہے کہ ہم غذا کے حدود تک پہنچنے سے پیشتر ہی آبادی

کے اضافہ کو روک دیں - اور اس کا طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ قصداً اور ارادۃً "اہلیت پیدا وارِ اولاد" کو قابو میں رکھا جائے - غذا میں اضافہ کی کوششوں سے محض عارضی نفع حاصل ہو سکتا ہے - بڑھتی ہوئی آبادی اس کو فوراً ضائع کر دیتی ہے - اخیر میں 'دنیا' صرف ایک محدود تعداد کی کفیل ہو سکتی ہے - برتن میں ربڑ کی طرح پھیلنے کی اہلیت ہے لیکن پھر بھی یہ بند منھ کا برتن ہے - اور ایک مقررہ مقدار سے زیادہ اس میں چیزیں نہیں سما سکتیں - پیش بینی، کفایت شعاری اور اہلیت کارکردگی میں ترقی، صرف اس صورت میں، جب کہ تعداد قائم رہے، اضافۂ مسرت کا سبب ہو سکتے ہیں - اس کے بعد پروفیسر ایسٹ متنبہ کرتا ہے کہ زائد از ضرورت آبادی اور اس کی وجہ سے تباہی و غارتگری سے ہم روز بروز نزدیک ہوتے جا رہے ہیں اور علاج کے طور پر وہ "ولادت کی عناں گیری" کی طرف سب کو مائل کرنا چاہتا ہے - مگر اس کی طرف سے بھی اُسے مایوسی ہے اور وہ خیال کرتا ہے کہ دنیا اس علاج کا استعمال، وقت نکل جانے کے بعد کرے گی اور تباہی و مصیبت سے اُسے نجات نہ مل سکے گی - اس غرض کے حصول کے لئے وہ چاہتا ہے کہ حکومت کی طرف سے "ولادت کی عناں گیری" کے لئے ایک قانون بنا دیا جائے اور اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزا دی جائے - پروفیسر ایسٹ کے نزدیک، افزائش نسل کا "بالقوۃ نرخ" (Potential rate of Increase.) کم از کم ۶۰ فی ہزار سالانہ کہا جا سکتا ہے - مگر یورپ کے کسی ملک میں حتیٰ کہ روس کے بعید ترین صوبوں کے کسانوں میں بھی یہ نرخ، کہیں چالیس فی صدی سے زیادہ نہیں ہے - اس سے ثابت ہوتا ہے کہ "ولادت کی عنان گیری" پر عمل ہو رہا ہے اور اس لحاظ سے ایسٹ کے اندیشے بے بنیاد ہیں -

ایسٹ کے علاوہ پرل نے بھی نظریہ آبادی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے - مگر اس کے طریقہ بیان میں، حساب و اقلیدس کی اصطلاحیں بہت ہیں جسکی وجہ سے یہاں اُس کے نظریے کو تفصیل کے ساتھ پیش کرنا ممکن نہیں ہے - مگر اس کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اضافہ آبادی کو، آبادی کی کثرت سے ایک منفی نسبت حاصل ہے یعنی اگر آبادی میں کثرت ہو جائے تو اضافہ کی مقداریں خود بخود کمی ہو جائیگی - اس پر اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اضافہ کی مقداریں خود بخود کمی قدرتی اسباب کی بنا پر نہیں ہوتی بلکہ اس کا سبب غذا، ہوا، روشنی کی قلت اور نقل و حرکت کی مشکلات وغیرہ ہوتی ہیں -

لورپول کے پروفیسر اے - ایم - کارسانڈرس نے بھی مسئلہ آبادی کے متعلق ایک جامع و مانع حل پیش کیا ہے وہ آبادی کی کیفیت اور کمیت دونوں سے بحث کرتے ہیں - انھوں نے (Optimum number) "متوازن تعداد آبادی" کے تخیل کو پیش کر کے، مسئلہ کے ایک اچھوتے پہلو پر روشنی ڈالی ہے - ہر چند اس قسم کا تخیل فلاطون کی "جمہوریت" میں بھی ملتا ہے جہاں اُس نے ایک شہری حکومت کی مناسب تعداد پانچ ہزار چالیس

افراد بتلائے ہیں۔ اور یہ خیال اس کے بعد بھی لوگوں کے ذہن میں رہا ہے۔ مگر مکمل نظریہ کی شکل میں پیش کرنے کا سہرا اسانڈرس کے ہی سر ہے" متوازن تعداد" سے اُس کی مراد، اس قدر آبادی ہے جس کے ذریعہ سے رائج الوقت طریقہ تنظیم صنعت میں، زیادہ سے زیادہ دولت فی کس پیدا کی جاسکے۔ یہ تعداد ہمیشہ کے لئے مقرر نہیں کی جاسکتی بلکہ مختلف حالات کے ماتحت بدلتی رہتی ہے۔ آبادی کی کیفیت کا اس "متوازن تعداد" کے معیار سے تعین کیا جاسکتا ہے اور "کمیت" کو مندرجہ بالا "کیفیت" کے مطابق بنانے کے لئے وہ ولادت کی عناں گیری کی تجویز پیش کرتا ہے۔

مسٹر جے۔ سوئنبرن نے بھی آبادی کے متعلق اپنے فلسفہ کا اظہار اپنی کتاب "آبادی اور مسئلہ اجتماعی" میں کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ لوگ دنیا کی پریشانیوں کے اصلی سبب یعنی زائد از ضرورت آبادی کی طرف کیوں متوجہ نہیں ہوتے، جب تک اس کے سمجھنے کی کوشش نہیں کی جائے گی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ حکومتوں میں تبدیلی، محض بے کار ہے۔ سرمایہ اور مزدور کے تعلقات میں انقلاب پیدا کرنے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ صنعت کی ترقی بے سود ہے۔ اس قسم کی جس قدر تبدیلیاں ہوتی ہیں اور جنھیں ترقی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، ان کی وجہ سے، کچھ زیادہ آبادی کے لئے، نسبتاً بہتر مواقع، آرام پانے اور مصیبت سے بچنے کے پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر انسانی مصیبتوں میں، بصورت مجموعی، ان کی وجہ سے کوئی تخفیف نہیں ہوتی۔ مگر اب اُمید کی روشنی نظر آرہی ہے اور مسئلہ کا حل پیدا ہونے والا ہے۔ چار ہزار سال یا اس سے زیادہ کے بعد، صرف گذشتہ ایک صدی کے عرصہ میں یہ تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ تقریباً ۷۰ سال سے خاندان کو محدود رکھنے کی تحریک پر عمل کیا جارہا ہے۔ اس کی ابتدا، متوسط طبقہ سے ہوئی اور اب یہ امیروں اور غریبوں دونوں میں پھیلتا جارہا ہے۔ اور رفتہ رفتہ یہ اس قدر پھیل جائے گا کہ سوسائٹی کے موجودہ تعلقات میں انقلاب رونما ہو جائیگا۔ انسان نے جس قدر انکشافات کئے ہیں، اُن میں سب سے زیادہ اہم اول تو یہ انکشاف ہے کہ اولاد کی تعداد محدود رہنا چاہئے اور دوسرا انکشاف اس مقصد کے حصول کے ذرائع و طریقے ہیں۔

پروفیسر کینس کو، جنگ کے بعد کے اقتصادیین میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ پروفیسر کینس جہانتک مستقبل قریب کا تعلق ہے، امریکہ کے متفاولی اقتصادیین کے ہم خیال ہیں مگر مستقبل بعید کے متعلق وہ مخالف ہیں اُن کا خیال ہے کہ "قانون تقلیل حاصل" اب متروک ہوگیا ہے۔ کیونکہ اب صنعت و زراعت دونوں سے، محنت و سرمایہ کے ہر اضافہ کے بعد زیادہ پیداوار حاصل کی جاسکتی ہے مگر مطلع پر بادلوں کے آثار، نمایاں ہو رہے ہیں۔ آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ جنگ سے قبل ہی یہ خطرناک حد تک بڑھنا شروع ہوگئی تھی اور آج یورپ کے ہر ملک میں آبادی بہت کثیر نظر آتی ہے۔ یہ آبادی نسبتاً ایک بلند معیار پر زندگی بسر کرنے کی عادی ہے اور اس حالت

میں بھی آبادی کے بعض طبقات، تنزل کی جگہ ترقی کی توقع رکھتے ہیں۔ کینس، معیار حیات کی بلندی کو، کثرت آبادی کا ایک موثر مانع خیال کرتا ہے اور اس کا خیال ہے کہ آبادیوں میں تبدیلی، معیار حیات کی تبدیلی کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ اس کے بعد، کینس، متشائم خیالات کا اظہار کرتا ہے: وہ کہتا ہے کہ زائد از ضرورت آبادیوں کے لئے اب یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ہجرت کر کے کسی ایسے دوسرے ملک میں چلی جائیں جو اُن کا خیر مقدم کرنے کے لئے آمادہ ہو۔ اس لئے ہمارے سامنے معیار حیات کی پستی کا خطرہ ہمیشہ موجود ہے۔ جس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ ہوئے کہ اگر آبادی کے اضافہ کو نہ روکا گیا تو لوگوں کی مالی حالت ضرورت پست ہو جائیگی۔

پروفیسر کینس کے ہم عصر، مسٹر ہیرلڈ رائٹ کا بھی قریب قریب وہی خیال ہے جو پروفیسر کینس کا ہے۔ لیکن انھوں نے اس مسئلہ کی زیادہ وضاحت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر چند یہ صحیح ہے کہ عارضی طور پر انیسویں صدی کی سرمایہ دارانہ تنظیم صنعت نے، مالتھس کے نظریہ کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ مگر پھر بھی ہمیں اس کی صداقت کا آخر میں، ضرور اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ انسان ہمیشہ مالتھس کے نظریہ سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ اُس کی تمام مساعی کبھی بھی اس بات میں کامیاب نہیں ہوئیں کہ جس قدر اولاد پیدا ہوتی رہی اُس کے ایک حقیر حصہ کی پرورش سے زیادہ زمین سے غذا حاصل کر سکیں۔ یہ معلوم کرنے کے بعد کہ کچھوا خرگوش سے کبھی بازی نہیں جیت سکتا، ابتدائی انسان نے اس بات کی انتہائی کوشش شروع کر دی کہ کسی نہ کسی طرح، خرگوش کو سو جانے کے لئے راضی کر لے۔ اس کا ثبوت ہمیں اس بات میں ملتا ہے کہ ابتدائی انسان ہر جگہ اسقاط حمل، طفل کشی، یا مباشرت سے طویل اجتناب کے موثر موانع میں سے ایک نہ ایک پر عمل کرتا ہوا پایا گیا ہے۔ مسئلہ آبادی کے دو ہی حل ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ پیداوار میں اضافہ کیا جائے اور دوسرے یہ کہ اولاد کی پیدائش کو کم کیا جائے۔ دنیا کی زندگی کو قابل برداشت بنانے کے لئے دونوں طریقوں کا استعمال ضروری ہے۔

اب ہم مسئلہ آبادی کے متعلق جس قدر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے اُسے ختم کرتے ہیں اور اسی مسئلہ کے متعلق اپنے نتائج پیش کرتے ہیں۔ سب سے اول ہم اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ آبادی کی غیر محدود وسعت انسانی ترقی کی راہ میں سخت ترین روکاوٹ ہے جس کے روکنے کے لئے "ولادت کی عنان گیری" نہایت ضروری ہے بغیر اس کے کسی مستقبل ترقی کا امکان پیدا نہیں ہو سکتا۔ جہاں اخلاقی ضبط ممکن ہو، وہاں اخلاقی ضبط سے ورنہ دیگر موانع اولاد سے، آبادی کی کمی کے مقصد کو حاصل کرنا چاہیئے۔ معیار حیات کی ترقی سے بھی یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کو ترقی دینا بھی ہمارا مطمح نظر ہونا چاہیئے مگر "ولادت کی عنان گیری" کے متعلق اس قدر

کہنے کے بعد، میں یہ ماننے کے لئے کبھی طیار نہیں ہوں کہ دنیا کی تمام موجودہ اقتصادی مشکلات و مصائب کا واحد سبب کثرت آبادی ہے۔ مالتھس اور اس کے رفقا نے، کثرت آبادی کو مبالغہ آمیز حد تک اہمیت دے دی ہے۔ کثرت آبادی موجودہ مصائب کا ایک سبب ضرور ہو سکتی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم اور اسباب ہیں جن کے رفع کرنے سے، دنیا کے بے شمار مصائب کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک سبب موجودہ نظام سرمایہ داری اور غیر مساوی تقسیم دولت ہے کہ جن کی وجہ سے محنت کرنے والوں اور بے کار رہنے والوں کی دو جماعتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بے کار رہنے والے، سرمایہ اور زمین پر اجارہ رکھتے ہیں اور کام کرنے والے، کٹھ پتلی کی طرح اُن کے اشارہ چشم و ابرو پر ناچتے رہتے ہیں۔ اس اجارہ کی وجہ سے، محنت کرنے والوں سے وہ نہ صرف اپنے گذر اوقات کے ضروری سامان حاصل کرتے ہیں بلکہ انھیں مجبور کرتے ہیں کہ اُن کے ذاتی تعیشات اور وقتی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے وہ، اپنا کثیر وقت ضائع کرتے رہیں۔ جس قدر سرمایہ اور ذہانت بے دردی سے، اس طرح چند افراد کی خاطر ضائع ہوتا ہے، اُس سے، محض موجودہ آلات صنعت اور سائنس کی ترقیوں کے ساتھ، سیکڑوں خانماں برباد خاندانوں کے لئے، ابتدائی ضرورت اور عام منفعت کی اشیاء بنائی جا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ، بین الاقوامی حرص آز، رشک و حسد، ہوس ملک گیری، اور جذبۂ شہنشاہیت ایسے اسباب ہیں، جنھوں نے تمام دنیا کی صنعت و تجارت کے توازن کو برباد کر دیا ہے۔ وسائل آمد و رفت و خبر رسانی کی ترقی کے ساتھ، قدرتی سرحدیں بیکار ہو گئی ہیں۔ مگر ان کی جگہ لینے کے لئے، زبردستی نئے موانع، امتناعی محاصل اور انتقال آبادی کے خلاف توانین بنا کر پیدا کئے جاتے ہیں۔ قومیت کے سرد جذبات میں ہیجان برپا کیا جاتا ہے۔ خوف و عناد بھڑکایا جاتا ہے سامان حرب کی تیاری اور فنون جنگ کی ترقی میں، قومی محنت، ذہانت اور سرمایہ ضائع کیا جاتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تعمیر تہذیب کے وسائل کو ترقی دینے کی جگہ، ماہرین سائنس اور مدبرین سلطنت، اسباب تاخت و تاراج بنانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

اب اگر جنگ کے امکانات، دنیا سے فنا ہو جائیں، اور قومی اور بین الاقوامی معاملات میں، انصاف، مساوات اور حریت کے اصول پر عمل ہونے لگے تو دنیا کے بہت سے مصائب کا ازالہ ہو جائے۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ اگر "تولید و تناسل کی عناں گیری" کا مطمح نظر بھی سامنے رہے تو اصلاح و تہذیب کی ترقی ایک مستقل شکل اختیار کر لے۔

محمد عاقل، ایم۔ اے (علیگ)

فتح

(افسانہ)

اس کا نام شاہزادی اجیتا تھا اور راجہ نارائن کے دربار کے شاعر نے اسے کبھی نہ دیکھا تھا۔ لیکن جب وہ کوئی نئی نظم راجہ کو سناتا تو اتنی بلند آواز سے گاتا کہ اس کے نغمے بالاخانہ کی چلمنوں کے پیچھے نادیدہ سامعین کے کانوں تک بھی پہونچ جاتے۔ وہ اپنے نغموں کو وہاں تک پہونچانا چاہتا تھا جہاں وہ خود نہ پہونچ سکتا تھا، یعنی اس تاروں بھری دنیا میں جہاں اس کی قسمت کا ستارہ حد نظر سے دور، ایک حلقۂ نور کے اندر جگمگایا کرتا تھا۔

کبھی کبھی پردوں کے پیچھے اسے کوئی سایہ سا حرکت کرتا نظر آتا اور وہ اس سایہ کی رعنائی کو دیکھ کر گھنٹوں محو حیرت رہتا کبھی دور سے چھم چھم کی آواز اس کے کانوں میں پہونچتی اور وہ ان خوبصورت ایڑیوں کا خواب دیکھنے لگتا جن پر پڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے سنہرے گھونگھروؤں سے ہر ہر قدم پر بارش نغمہ ہوا کرتی ——— آہ وہ گلابی نازک پاؤں! شاعر نے انھیں اپنے دل کے مندر میں بسا لیا تھا جہاں اس کی روح ہر وقت دوزانو رہا کرتی تھی۔ لیکن بایں ہمہ وہ کبھی یہ نہ سمجھ سکا کہ پردوں کے پیچھے کس کا سایہ نظر آتا ہے اور وہ نازک ایڑیاں کس کی ہیں جن کے گھونگھروؤں کی صدا اس کے دل کی حرکت کو اپنا ہم آہنگ بنا لیتی ہے۔

شاہزادی کی ایک کنیز جس کا نام منجری تھا، جب روزانہ دریا جاتے ہوئے شاعر کے گھر کے پاس سے گزرتی تو ایک آدھ بات شاعر سے بھی ضرور کر لیا کرتی اور جب سڑک سنسان ہو جاتی، شام کا دھندلکا زمین پر چھا جاتا، تو وہ چپکے سے اس کے مکان میں داخل ہو جاتی اور فرش کے ایک کونہ پر بیٹھ جایا کرتی تھی —— بالوں میں عجیب انداز سے گندھے ہوئے پھول اور ہلکے رنگ کا نقاب جس پر افشاں کے ذرے چمکا کرتے، منجری کی وہ خصوصیت تھی جو کسی اور کنیز کو حاصل نہ تھی۔ لوگ اس پر مسکراتے اور سرگوشیاں کیا کرتے کیونکہ شاعر نے (جس کا نام شیکھر تھا) کبھی اس بات کے چھپانے کی کوشش نہیں کی کہ یہ ملاقاتیں اس کے لئے بڑی مسرت کا باعث ہوا کرتی ہیں۔

منجری کے معنے "پھول کی ٹہنی" کے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ عام آدمیوں کے لئے اس نام میں یوں بھی کافی دلکشی پائی جاتی ہے، لیکن شاعر کچھ اضافہ کے ساتھ اسے "بہار کے پھولوں کی ٹہنی" کہا کرتا۔ لوگ سنتے اور کہتے "ہائے افسوس"!

شاعر بہار یہ نظموں میں اس "بہار کے پھولوں کی ٹہنی" کا ذکر ضرور کرتا اور جب راجہ سنتا تو مسکراتا، اور

شاعر بھی جواباً مسکرا دیا کرتا۔

بادشاہ اس سے پوچھتا "کیا شہد کی مکھی کا صرف یہی کام ہے کہ بہار کے حضور میں بھنبھناتی رہے؟"

شاعر کہتا "نہیں، بلکہ بہار کے پھولوں کی ٹہنی کا شہد حاصل کرنا بھی اس کا کام ہے" اس پر راجہ کے درباری ہنس پڑتے۔ اور سنا گیا ہے کہ شاہزادی اجتیا بھی ہنسا کرتی کہ اس کی خادمہ اپنے نام کے ساتھ شاعر کا نام وابستہ ہو جانے پر خوش ہے۔

اسی طرح دنیا میں جھوٹ اور سچ مل جل جاتے ہیں اور خدا جو کچھ بناتا ہے آدمی اس میں اپنی طرف سے بہت کچھ اضافہ کر دیتا ہے۔

شاعر کے نغموں میں صداقت تھی۔ اس کی نظموں کا موضوع "کرشن" اور اُن کی محبوبہ "رادھا" ـــ ازلی ابدی مرد و عورت ـــ تھے، یعنی وہ درد جو ابتدا سے ہے اور وہ خوشی جس کی انتہا نہیں۔ اس کے نغموں کی صداقت کا ہر شخص معترف تھا اور شاہ سے لیکر گدا تک اس کی عزت کرتا تھا۔ شاعر کی نظمیں زبان زد عام تھیں۔ چاند کی روشنی میں، بہار کی خوشگوار ہواؤں میں، کھڑکیوں سے، کشتیوں سے، عام گزرگاہوں پر، درختوں کے سایوں میں الغرض ہر جگہ اس کی نظمیں گائی جاتی تھیں۔

اسی طرح دن خوشی خوشی گزرتے گئے۔ شاعر اشعار گاتا، راجہ سنتا، لوگ واہ واہ کرتے، شاعر بالاخانے کی چلمنوں کے پیچھے سایہ حرکت کرتا دیکھتا اور دور سے ننھے ننھے طلائی گھنگھروؤں کی آواز سنا کرتا......

اسی زمانہ میں ایک اور شاعر جنوب کی طرف سے روانہ ہوا وہ قلمرو امر پور میں راجہ نارائن کے دربار میں حاضر ہوا تخت کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے راجہ کی تعریف میں ایک شعر پڑھا۔ اور پنڈارک (یہی شاعر کا نام تھا) نے مغرورانہ انداز میں جواب دیا "مہاراج میں دربار کے شاعر سے مقابلہ چاہتا ہوں!"

راجہ کے دربار کا شاعر "شیکھر" نہ جانتا تھا کہ مقابلہ کس طرح ہوگا۔ رات بھر اسے نیند نہ آئی۔ مشہور و معروف "پنڈارک" کا بھاری بھر کم ڈیل ڈول اس کی کٹار کی سی مڑی ہوئی ناک اور اس کا بڑا اسر رات کی تاریکی میں، اُس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا رہا۔

کانپتے ہوئے دل کے ساتھ شیکھر دربار میں داخل ہوا چاروں طرف کرسیاں لوگوں سے پُر تھیں۔ شاعر نے اپنے حریف کا خیر مقدم سر جھکا کر ایک تبسم سے کیا۔ پنڈارک نے بھی اس کا جواب سر کے ایک ہلکی سی جنبش سے دیا اور ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اپنا چہرہ اپنے مداحوں کی طرف پھیر لیا۔

شیکھر نے اوپر بالاخانہ کی چلمنوں کی طرف نظر ڈالی اور دل ہی دل میں کہا "اگر آج کے مقابلہ میں کامیاب

رہا تو اے میری ملکہ! تیرے ارجمند نام کی عظمت اور بڑھ جائے گی"

نوبت بجنے لگی۔ ہجوم "مہاراج کی جے" کا نعرہ لگاتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ راجہ سفید لباس پہنے خزاں کے تیرتے ہوئے ابر کی طرح آہستہ آہستہ کمرہ میں داخل ہوا اور تخت پر بیٹھ گیا۔

پنڈارک کھڑا ہوا اور وسیع کمرہ میں بالکل خاموشی طاری ہو گئی۔ سر کو اوپر اٹھا کر، سینہ پھیلا کر اپنی گرجتی ہوئی آواز میں اس نے راجہ نارائن کے مدح میں اشعار پڑھنا شروع کئے۔ اس کے الفاظ کمرہ کی دیواروں سے اس طرح ٹکراتے تھے جیسے سمندر کی لہریں ساحل کی چٹانوں سے، اور معلوم ہوتا تھا کہ سامعین کی پسلیوں سے انکا تصادم ہو کر کھڑ کھڑاہٹ پیدا ہو رہی ہے! جس ہشیاری سے اس نے نارائن کے نام کے مختلف معانی بیان کئے اور ہر ہر حرف کو جس انداز سے اس نے اپنے اشعار میں باندھا اس کو سنکر لوگ متعجب اور دم بخود ہو گئے۔

اس کے بیٹھ جانے کے کچھ دیر بعد تک بھی اس کی آواز ہزاروں خاموش دلوں اور دربار کے بے شمار ستونوں کے درمیان گونجتی رہی۔ فاضل پنڈت جو دور دراز ملکوں سے آئے تھے اپنے داہنے ہاتھ اٹھا کر چلائے "واہ واہ"!

راجہ نے شیکھر کے چہرہ پر ایک نظر ڈالی اور شیکھر نے جواب میں اپنی دردمند آنکھیں ایک لمحہ کے لئے اپنے آقا کی طرف اٹھائیں اور اس کے بعد زخمی ہرن کی طرح کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور اسپر عورتوں کی سی شرم طاری تھی۔ اس کا لاغر، نازک بدن ایک ایسے ستار کے مانند تھا جس کے تار ضرورت سے زیادہ تنے ہوں اور صرف چھیڑنے کی دیر ہو۔

ابتدا میں اس کی آواز دھیمی تھی اور اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ پہلے چند اشعار تو قریب قریب ناسموع تھے لیکن اس نے اپنا سر آہستہ آہستہ اٹھایا اور اس کی صاف شیریں آواز لرزتے ہوئے شعلہ کی طرح آسمان کی طرف اٹھنے لگی۔ اس نے شاہی خاندان کی ان پرانی روایات سے جو ماضی کی دھندلی فضا میں کھو گئے تھے ابتدا کی اور اپنے آقا کے آباؤ اجداد کی بہادری اور بے نظیر سخاوت کے کارناموں کا سلسلہ موجودہ عہد سے ملا دیا۔ اس نے راجہ کے چہرہ پر اپنی نگاہیں جما دیں اور شاہی خاندان کی محبت خوشبو کی طرح اس کے نغمہ سے نکلی اور تخت کے چاروں طرف پھیل گئی! جب وہ کانپتے ہوئے اپنی جگہ پر بیٹھا تو یہی الفاظ اس کی زبان پر تھے "میرے آقا" میں الفاظ کے ہیر پھیر میں شکست کھا سکتا ہوں لیکن تیری محبت میں نہیں ہار سکتا!

سامعین کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں اور سنگین دیواریں "فتح" کے نعروں سے گونج اٹھیں!!

سر کی ایک پر شکوہ جنبش اور حقارت آمیز تبسم کے ساتھ عام جذبات کے جوش کی تضحیک کرتے ہوئے پنڈارک کھڑا ہو گیا اور مجمع کے سامنے اس نے یہ سوال پیش کیا کہ "الفاظ سے برتر دنیا میں کیا چیز ہے؟" اور یکایک کمرہ میں پھر سناٹا چھا گیا۔

اس کے بعد اپنی قابلیت کا معجزانہ اظہار کرتے ہوئے اس نے ثابت کر دیا کہ لفظ ہی ہر چیز کی ابتدا ہے، اپنے شاستروں اور دوسری مقدس کتابوں کے حوالوں اور اقتباسات کا ڈھیر لگا دیا اور اس طرح لفظ کو زمین و آسمان کی تمام چیزوں سے بلند ثابت کر دیا!...... اور اپنی بلند آواز میں یہ سوال پھر دہرایا کہ لفظ سے برتر دنیا میں کیا چیز ہے؟ اس نے اپنے اردگرد متکبرانہ انداز سے دیکھا۔ کسی کو اس کے مقابل ہونے کی جرأت نہ ہوئی اور ایک ایسے شیر کے مانند جو اپنے شکار سے شکم سیر ہو چکا ہو بہ آہستگی اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ پنڈت پھر واہ واہ چلائے۔ راجہ حیرت سے خاموش تھا اور شیکھر شاعر اپنے آپ کو اس علم و فضل کے سامنے بالکل بے حقیقت محسوس کر رہا تھا مجلس دوسرے روز کے لئے برخاست ہوئی۔

دوسرے روز شیکھر نے اپنے نغمہ سے ابتدا کی جو اس واقعہ سے متعلق تھا جب پریم کی بانسری کے شیریں ترانے "بندرابن" کی خاموش فضا میں پہلے پہل لہرائے تھے اور عورتوں کو نہ معلوم تھا کہ بانسری کون بجا رہا ہے اور یہ راگ کہاں سے آرہے ہیں۔ کبھی انھیں ایسا معلوم ہوتا کہ نغمے باد جنوب کے دوش پر سوار ان تک پہونچ رہے ہیں اور کبھی وہ یہ سمجھتیں کہ نغموں کا یہ چشمہ پہاڑ کی چوٹیوں پر تیرتے ہوئے ابر سے ابل پڑا ہے۔ یہ مشرق سے عاشقوں کے لئے پیام محبت لاتیں اور آہیں بنکر مغرب میں جا گرتیں! معلوم ہوتا تھا کہ راگ یکایک چار و طرف سے ابل پڑا ہے، میدانوں اور چمنوں میں، تاریک گلیوں اور ویران سڑکوں میں آسمان کی پگھلتی ہوئی نیلاہٹ میں چمکدار سبز گھاس اور وسیع مرغزاروں میں راگ ہی راگ تھا.............. وہ نہ تو اس کے معنی سمجھتیں اور نہ انھیں اپنی دلی خواہشات کے اظہار کے لئے الفاظ ملتے! ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں اور انکی "زندگی"۔ موت کی خواہشمند معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ یہی ایک ذریعہ تھا جس سے وہ اس درد و کرب اور خلش روحی سے نجات پا سکتی تھیں!............... شیکھر سامعین کو بھول چکا تھا۔ اسے اپنے حریف سے مقابلہ کا بھی کچھ خیال نہ رہا تھا۔ وہ اپنے خیالات کے ہجوم میں "بانسری کے راگ" کا نغمہ گائے جا رہا تھا۔ اس وقت اس کے دماغ میں ایک ایسی عورت کا خیال تھا جو ایک سایہ سے صورت پذیر ہوئی تھی اور ان گھنگھروؤں کی آواز کا جو اُس کے دل و دماغ میں ہر وقت بسے رہتے تھے.........!!

وہ بیٹھ گیا سننے والے ایک ناقابل بیان مبہم مسرت کی کیفیت سے تھرتھرا رہے تھے اور وہ نعرۂ تحسین و آفریں بلند کرنا بھی بھول گئے۔ جب جذبات کا یہ تلاطم کچھ کم ہوا تو پنڈارک تخت کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اپنے حریف سے کہا کہ وہ اس عاشق کی تعریف کرے اور بتلائے کہ وہ معشوقہ کون تھی اس نے اپنے چاروں طرف ایک پُرغرور نگاہ ڈالی، اپنے مداحوں کی طرف دیکھکر مسکرایا اور پھر دوبارہ سوال کیا "کرشن عاشق اور رادھا

محبوبہ کون ہیں ؟"

تب اس نے خود ہی اُن ناموں کے مادہ کی تشریح کرنی شروع کی اور ان کے کئی کئی معنے بیان کئے۔ اُس نے اپنے متحیر سامعین کے سامنے کامل ہنرمندی کے ساتھ روحِ انسانی اور علم موجودات کے معموں کو بیان کیا۔ پھر اُس نے ان ناموں کے ایک ایک حرف کو ایک دوسرے سے علیحدہ کیا اور اپنی بے پناہ منطق سے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے بالکل بے معنی کردیا اور اس نے دوبارہ اس لفظ کو پیدا کرکے اس کا ایک ایسا نیا مفہوم بتایا جو کسی بڑے سے بڑے فاضل کے تصور میں بھی نہ آیا تھا۔

پنڈت وجد کے عالم میں تھے۔ وہ تحسین و آفریں کی صدا زور و شور سے بلند کررہے تھے۔ اور مجمع بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہوکر کہ آج وہ اپنی آنکھوں سے سچائی کی آخری دھجیاں علم کی عجیب طاقت کے سامنے تار تار ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ اس کے اس عقل فرسا کارنامے کو دیکھکر وہ اتنے خوش ہوئے کہ وہ یہ خیال کرنا بھی بھول گئے کہ آخر ان باتوں میں کچھ حقیقت بھی ہے ؟

راجہ دریائے حیرت میں غرق تھا۔ فضا موسیقی سے بالکل خالی ہوچکی تھی اردگرد کی خیالی تازگی اور سرسبزی کی جگہ پتھروں نے لے لی تھی۔ لوگوں کو اس دیو کے سامنے جو دنیائے الفاظ و خیالات میں ہر قدم پر مشکلات کو روندتا چلا جاتا تھا اپنا شاعر بالکل طفل مکتب معلوم ہونے لگا۔ انھیں اب پہلی مرتبہ یہ معلوم ہورہا تھا کہ شیکھر بالکل سیدھی سادھی نظمیں کہتا تھا۔

راجہ نے معنی خیز نگاہوں سے اپنے شاعر کو دیکھا اور اُسے آخری کوشش کے لئے آمادہ کرنا چاہا۔ لیکن شیکھر نے کچھ خیال نہ کیا اور اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔

راجہ ناراض ہوکر تخت سے نیچے آیا اور اپنے گلے سے موتیوں کا ہار اتار کر پنڈارک کے گلے میں ڈالدیا کمرہ مسرت کے نعروں سے گونج اُٹھا۔ بالاخانہ سے کپڑوں کی سرسراہٹ اور سنہرے گھنگھروؤں کی ہلکی سی آواز آئی شیکھر اپنی جگہ سے اُٹھا......اور کمرہ سے باہر نکل گیا.........!

چاند زوال پر تھا، رات اندھیری تھی۔ شیکھر نے اپنی نظموں کے مسودے الماریوں سے نکال نکال کر زمین پر ڈھیر لگادی ان میں سے بعض اس کی ابتدائی نظمیں تھیں جنھیں وہ تقریباً بھول چکا تھا۔ وہ اوراق الٹ رہا تھا اور کہیں کہیں بعض بعض نظمیں پڑھتا جارہا تھا۔ اب یہ اسے بالکل بیکار معلوم ہوئیں۔ محض الفاظ اور طفلانہ خیالات کا مجموعہ !

اس نے ایک ایک کرکے اپنی کتابیں اور مسودے پرزے پرزے کردیئے اور ان الفاظ کے ساتھ نہیں

نذر آتش کر دیا کہ " تجھ پر اور صرف تجھ پر اے حسن! میں اپنا سب کچھ قربان کرتا ہوں! تیری آگ میرے سینہ میں بیکار سالوں تک بھڑکتی رہی۔ اگر میری زندگی سونا ہوتی تو اس آزمائش سے کندن بنکر نکلتی لیکن یہ روندی ہوئی گھاس ہے اور سوائے ایک مٹھی راکھ کے اب اس کی کوئی یادگار باقی نہیں رہی!".......

رات بھیگتی گئی۔ شیکھر نے اپنے مکان کی کھڑکیاں کھولدیں۔ اس نے اپنے بستر پر ان سفید پھولوں کو جنھیں وہ پسند کرتا تھا بچھا دیا اور جس قدر چراغ اس کے پاس تھے ان کو لاکر اپنے کمرہ میں روشن کر دیا۔ اس کے بعد کسی زہریلی بوٹی کا عرق شہد میں ملا کر پی گیا.......... اور بستر پر لیٹ گیا!.........

دروازے کے باہر سڑک پر سنہرے گھنگھروؤں کی آواز سنائی دی ہوا کا ایک معطر جھونکا کمرے میں آیا۔

شاعر نے آنکھیں بند کیے ہوئے کہا " میری ملکہ! اپنے غلام پر ترس کھا کر اس سے آخری وقت ملنے آہی گئیں؟"

جواب ایک شیریں آواز میں سنائی دیا " ہاں میرے شاعر میں آگئی ہوں "

شاعر نے آنکھیں کھولدیں اور اپنے بستر کے قریب ایک لڑکی کو دیکھا۔ اس کی بینائی دھندلی ہوگئی تھی اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ مورت جس کی حقیقت صرف خیال پر مبنی تھی اور جواب سے قبل اس کے دل کے مندر میں پوشیدہ طور پر متمکن تھی اب اس کے آخری ساعت میں اس کو دیکھنے کے لئے باہر کی دنیا میں آگئی ہے ——

لڑکی نے کہا " میں شاہزادی اجیتا ہوں "

شاعر انتہائی کوشش کے بعد اپنے بستر پر اُٹھ بیٹھا۔

شاہزادی نے آہستہ سے اس کے کان میں کہا " مہاراج نے تمھارے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ میرے شاعر مقابلہ میں تم ہی کامیاب رہے اور میں تمھارے سر " فتح " کا سہرا باندھنے آئی ہوں! "

اُس نے پھولوں کا ہار اپنے گلے سے اتار کر اس کے سر پر رکھدیا۔ شاعر بستر پر گر پڑا اور اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی!......... (ماخوذ)

ایم - زبیر احمد

شمیم

کا دوسرا ایڈیشن عمدہ کاغذ پر دو ضخیم جلدوں میں شایع ہوا ہے۔ رنگین تصاویر جو اسی ناول کے لئے صدہا روپیہ صرف کرکے تیار کی گئی ہیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ قیمت ہر دو حصہ للعہ ر علاوہ محصول ڈاک (فرمائش کے ساتھ ۱ر کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں)

ملنے کا پتہ: منیجر نگار لکھنؤ

فارسی زبان کی پیدائش پر ایک مؤرخانہ نظر

جس طرح امتزاج عناصر سے دنیا میں نئی نئی چیزیں پیدا ہو کر نشو و نما پاتی ہیں اور فنا ہو جاتی ہیں اسی طرح دنیا میں قومیں بھی نشو و نما پا کر اوج اقبال پر پہونچتی ہیں اور مردہ ہو جاتی ہیں۔ پھر کچھ زمانہ بعد اُن کے عروج و زوال اور نکبت و اقبال کی تاریخ اساطیر الاولین بنجاتی ہے، ان کے باقیات آثار کہلانے لگتے ہیں۔ یہی حال مصریوں آشوریوں۔ فینیقیوں، کلدانیوں، اور بابل والوں کا ہوا۔ یہی کیفیت ایران کے اشکانیوں اور ساسانیوں پر گذری یہی حشر سندھ کے سامریوں اور باختر کے یونانیوں کا ہوا۔ اور یہی حادثہ ہندوستان اور افغانستان کے بدھ مت والوں پر گذرا۔

اگر آج مصر میں وادی الملوک کے مقبرے۔ غزہ کے اہرام اور دار الشمس (ہیلیو پولیس) کے کھنڈر آل فرعون کے ماتمدار ہیں، تو قصر شیریں۔ رام ہرمزو۔ کرمانشاہ، خرابۂ شاپور وغیرہ کے آثار قدیمہ بھی تمدن ایران کی مرثیہ خوانی کر رہے ہیں، اور اگر طیسفون۔ اور بابل کے خرابے آشوریوں اور بابلیوں کے نوحہ خواں ہیں، تو تکشاشیلا (ٹیکسلا) بامیاں (افغانستان) رومنجو دارو (ہندوستان)[1] اور پٹنہ وغیرہ کے آثار زمانہ بوذیت کے ہند و تمدن کی عبرت خیز داستانیں بنے ہوئے ہیں۔ پُرانے کھنڈر کھودنے یا قدیم تعمیرات کے دیکھنے یا مندروں اور مقبروں سے جو کتبے برآمد ہوتے ہیں ان کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مردہ اقوام کا تمدن کس قدر اوج پر پہونچگیا تھا اور انھیں کتبوں اور نقوش سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ کیا بولتے تھے اور کس طرح لکھتے پڑھتے تھے۔ الغرض ہر قوم کی زبان کی تاریخ اس قوم کے عروج و زوال کی تاریخ سے وابستہ ہے۔ اس لئے آئیے آج کی صحبت میں اسی اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے فارسی زبان کی پیدائش پر غور کریں لیکن ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مختصراً قدیم تاریخ ایران پر ایک نگاہ ڈال لی جائے۔

وجہ تسمیہ ایران

علما کے نزدیک دنیا کی تمام نسلیں چار اقسام اور ان کی شاخوں پر مشتمل ہیں۔ (۱) آریا۔ (۲) سامی۔ (۳) منغول۔ (۴) حبشی۔

---

[1] یہ ہندوستان میں سامری تمدن کا ایک مدفون خزانہ ہے۔ "رومن۔ جو۔ دارو" کے معنی "رومیوں کا گھر" ہیں۔ لفظ "جو" کے معنی سندھی زبان میں "کا" کے ہیں۔

عرب، فلسطین - مصر اور شمالی افریقہ کی تمام قومیں سام بن نوح کی نسل سے متعلق ہونے کے باعث سامی کہلاتی ہیں - چین و ماچین - جاپان - تبت - منگولیا - منچوریا - کوریا کی قومیں مغلی نسل سے ہیں - افریقہ اور جزائر بحر جنوبی وغیرہ کی ژولیدہ مو اور سیاہ فام قومیں حبشی النسل ہیں مغربی یورپ ایران اور شمالی ہندوستان کی قومیں آریا نسل سے ہیں - دنیا کی باقی قومیں انھیں چار نسلوں کے اختلاط باہمی سے پیدا ہوئی ہیں -

ایران والے آریا نسل سے ہیں اور اسی قوم آریا کی وجہ سے سرزمین رستم و اسفندیار کا نام "ایریان" یا "ایران" ہوا -

اس امر کے متعلق کہ قوم آریا کا اصلی گہوارہ کہاں تھا - کوئی قول فیصل[۱] نہیں ہے - بعض کا قول یہ ہے کہ آریا لوگ یا کم از کم وہ قوم جس نے ما قبل تاریخ ملک ایران پر متسلط ہو کر اس کو ایران کے نام سے موسوم کیا مصر سے آئی تھی - اور ایران سے اس قوم کی ایک شاخ بڑھتے بڑھتے ہندوستان پہونچی اور مصری تمدن اور مصری عقائد (گئوپوجا وغیرہ) اپنے ساتھ لیتی آئی - چنانچہ اب تک ہندوؤں کی ایک قوم نہایت فخر کے ساتھ خود کو "مصر یا مصرا" کہتی ہے اور اکثر برہمنوں کو "مصر جی" کے لقب سے پکارا جاتا ہے - علاوہ ازیں قدیم مصر اور ہندوستان کے اکثر نام بھی یکساں ہیں - مثلاً "رعمسیس" (یا رام آسیس) فرعون مصر - اور "رام" (رامائن کا مشہور ہیرو) دونوں میں "رام" موجود ہے - علاوہ ازیں "سیتی" فرعون مصر اور "سیتا" زوجہ رام دونوں کے ناموں کا مادہ ایک[۲] ہی ہے -

---

[۱] انسائیکلو پیڈیا برٹینکا کی تحقیق یہ ہے کہ قدیم ایرانی قوم مشرق سے آکر ایران میں آباد ہوئی جس کا کافی ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ ان کا ہندوستانیوں سے بہت گہرا تعلق تھا - اور دونوں ملکر ایک واحد قوم تھے جس کا نام "آریہ" تھا اس قوم کا اصلی وطن بحیرہ اسود اور بحیرہ خزر کے شمالی سواحلی میدان یعنی جنوب مشرقی روس تھا - وہاں سے وہ دشت قبچاق میں آئے اور پھر ترکستان ہوتے ہوئے دریائے جیحون و سیحون پار کر کے ایران پہونچے -

[۲] خط میخی یا بیکانی کی جو تحریریں مصر کے مقام تل العمرنہ (۱۴۰۰ ق م —) برآمد ہوئی ہیں ان سے ملک شام اور فلسطین کے بعض حکمرانوں کے نام معلوم ہوئے ہیں، مثلاً ارتامانیا - ارزادیہ - شودروت - اور وادی فرات کے بعض راجاؤں کے نام بھی ارتاتما - ستر تین - ارناشمرا - اور دشرت ہیں - واضح ہو کہ دشرتھ - دسرتھ یا جسرتھ سری رام چندجی کے والد کا بھی نام تھا -

لیکن زیادہ مقبول روایت یہی ہو کہ قوم آریا کا گہوارہ دراصل شمالی ایشیا تھا - یہی قول تلک مہاراج کی مشہور تصنیف "اوریون" میں درج ہے - وسطی ایشیا سے نکلکر یہ قوم دو طرف چلی گئی - ایک شاخ نے جانب مغرب خروج کیا اور مغربی یوروپ کی مورث اعلیٰ بنی - اور دوسری شاخ جنوب مشرق کی طرف راہی ہوئی اور اس نے بحیرۂ عرب اور خلیج فارس کے شمالی سواحل کے ملک پر متسلط ہوکر اس کو اپنے نام سے "ایران" موسوم کیا - اسی ایرانی شاخ نے بڑہتے بڑہتے جانب مغرب پیش قدمی کی اور دریائے "سندھو" کو عبور کر کے شمالی ہند پر قابض ہوگئی اور اس جدید مفتوحہ ملک کا نام اپنے نام پر "آریاورت" رکھا -

قدیم حکمراں خاندان آریا قوم کا نظام تمدن بطریقی قسم کا تھا - یعنی یہ قوم مختلف قبائل پر مشتمل تھی - ہر قبیلہ کا سردار یا بادشاہ اس قبیلہ کا سب سے بڑا بزرگ ہوا کرتا تھا - اور گویا تمام قبیلہ ایک ہی دادا کی اولاد ہوتا تھا - قبائل میں جو قبیلہ سب سے زیادہ صاحب حیثیت اور طاقتور ہوتا اوسی قبیلہ کا سردار جملہ قبائل کا شہنشاہ ہوتا تھا - اور تمام قبیلے اسی کے جھنڈے کے تلے جمع ہوتے تھے - روایات وقصص قدیم سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ایران میں پہلا حکمراں خاندان جو آریا نسل سے تھا وہ مہ آبادی کہلاتا تھا - دوسرا خاندان پیشدادیوں کا ہوا اسکے بعد کیانیوں یا اشکانیوں کو عروج ہوا اور پھر ساسانیوں کو - مہ آبادیوں کی تاریخ کا تو کوئی پتہ نہیں چلتا - مگر پیشدادیوں کا کچھ کچھ حال پرانی کتابوں میں ملتا ہے -

گیامرت ہر قوم اپنے مورث اعلیٰ کا کچھ نہ کچھ نام بیان کرتی ہے - زرتشتیوں کی مذہبی کتب میں ایران کے آدم اولین کا نام گیامرت بیان کیا گیا ہے - یہی وہ شخص ہے جس کو عربی زبان میں "کیومرث" کہتے ہیں - یہ شخص پیشدادیوں کا سب سے پہلا بادشاہ تھا - اس زمانہ میں لوگ عام طور پر گنجان جنگلوں اور پہاڑوں کے غاروں میں رہا کرتے تھے شکار کردہ جانوروں کے گوشت پر بسر اوقات ہوتی تھی جانوروں کی کھال سے ستر پوشی کیجاتی تھی امرا اور بادشاہ شیر چیتے کی کھال پہنتے تھے مویشی پالنا اسی زمانہ سے شروع ہوا - آریا قوم جو نئی نئی ایران میں آئی تھی اس ملک کے قدیم وحشی باشندوں سے جنگ

---

۵۱ ایران کے لوگ خصوصاً پیروان زردشت سنسکرت کے حرف "س" کو ہمیشہ حرف "ہ" سے ادا کرتے تھے - اس طرح لفظ "سندھو" (دریا) فارسی زبان میں "ہندو" بنگیا - اور یونانیوں نے حرف "ہ" گرا کر اچھا خاصہ "ہند" کر دیا -

۵۲ شاہنامہ فردوسی کی روایت یہ ہے کہ قرنہا قرن گذرے اس کوہستانی علاقہ میں جو کوہ جودی کی برفپوش چوٹیوں کے گرد واقع ہے زمانہ قدیم میں سام بن نوح کی نسل سے ایک قوم رہتی تھی جس کا مستقر سرزمین "مادہ" تھا (انگریزی میڈیا Media) یعنی زمانہ حال کا ملک آذربائی جان - یہ لوگ بہت جلد تنزل پذیر ہوکر وحشی وجاہل ہوگئے تھے -

کرتی رہتی تھی اور ان وحشی باشندوں کو آریہ قوم "دیو" کہتی تھی

ہوشنگ کیومرث کا بیٹا سیامک اس کا ولیعہد تھا۔ اس کا نام غالباً شیام کھ ہوگا اور سانولا سلونا رنگ ہونے کی وجہ سے یہ نام ماں باپ نے پیار میں رکھدیا ہوگا۔ اسی قسم کے نام ہندؤں میں ابتک موجود ہیں۔ مثلاً شیام سروپ۔ شیام سندر وغیرہ سیامک کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ دیوؤں کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا۔ غمزدہ باپ نے ۳۰ سال اور حکومت کی۔ اس کے بعد اس کا پوتا ہوشنگ تخت نشین ہوا۔ یہی وہ شخص ہے جسکو اہل عرب اوشنج کہتے ہیں۔ پتھر سے پتھر ٹکرا کر آگ جلانا اسی بادشاہ کے زمانہ میں معلوم ہوا تھا۔ جس روز آگ کا نکالنا معلوم ہوا اسی تاریخ سے جشن سدہ کی بنیاد پڑی اور اسی وقت سے آتش پرستی کی ابتدا ہوئی۔ اس نے ایک کتاب بھی لکھی جس کا نام "جاودان خرد" ہے

تہمورس ہوشنگ کے بعد اس کا بیٹا تہمورس تخت نشین ہوا۔ اسی کو اہل عرب طہمورث کہتے ہیں۔ اس بادشاہ کے عہد کا بہت بڑا حصہ جنگ وجدال میں گذرا۔ دیوؤں سے لڑ کر ان کو مغلوب کیا۔ اور طہمورث دیوبند کا لقب پایا۔ باغی اقوام کی جان بخشی اس علم دوست اور رحمدل بادشاہ نے اس شرط پر کردی کہ وہ لوگ اس کو مختلف زبانیں اور خط وکتابت کا فن سکھا دیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ بادشاہ تیس زبانیں جانتا تھا۔ اسوقت تک ایران میں آریا قوم کی اصلی زبان یا سنسکرت بولی جاتی تھی۔ یہیں سے اختلاط زبان شروع ہوکر اردو کی طرح ایک جدید زبان پیدا ہوئی اور یہی وہ زبان ہے جو ایران کی لنگوا فرینکا یا ملکی زبان قرار پائی۔

جمشید طہمورث دیوبند کے بعد اس کا لائق بیٹا جمشید تخت نشین ہوا۔ جس کی شوکت وحشمت اور عظمت

سلہ کیومرث عوام میں "پیشداد" (عادل ومنصف) کے نام سے مشہور تھا۔ اسی لئے جو خاندان شاہی اس نے قائم کیا اسے "پیشدادیان" کہتے ہیں۔ اس بادشاہ نے لوگوں کو وحشت وبربریت سے نکالا۔ ان کو مل جل کر رہنا سکھایا۔ عدالت گاہیں قائم کیں چنانچہ اطراف وجوانب کی قومیں بھی اس کے راج کی برکتیں سنکر اس کی مطیع ہوگئیں۔ اُس نے مشرق کی جانب اپنے بھائی کو روانہ کیا اور کچھ دنوں بعد خود اس سے ملنے گیا۔ دونوں بھائیوں کی ملاقات ایک زرخیز وادی میں ہوئی جہاں اس تقریب کی خوشی میں شہر بلخ یا باختری بسایا گیا۔

سلہ گویا ایران کی کتب معلومہ میں سب سے پہلی کتاب یہی ہے۔ اور اسی سے فن انشاء وادب کی ابتدا ہوتی ہے۔

سلہ اس وقت کے ایران میں بقول ہیرودوطوس ومطابق کتبہ داریوس جو کوہ بہستون پر پایا جاتا ہے۔ حسب ذیل بڑی بڑی قومیں آباد تھیں۔

(ملاحظہ ہو بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۳)

وجلال کے افسانے ابتک مشہور ہیں - اس بادشاہ نے اپنے نام سے ایک نیا شہر بسایا اور اس کو دارالسلطنت بنا کر اس کا نام اپنے نام پر تخت جمشید رکھا - اسی کا نام بعد میں استخر ہوا کہتے ہیں کہ اس کی حکومت بحر و بر ہر جگہ تھی - اس کا تخت دنیا بھر میں اڑا اڑا پھرتا تھا - غالباً اصل واقعہ یہ ہوگا کہ شاہی دورہ کے وقت اس کے ساتھ بکثرت خدم حشم ہوتا ہوگا - اور لوگ دیکھ دیکھ کر کہتے ہوں گے کہ تمام "تخت جمشید (یعنی پایہ تخت) اُٹھ آیا - آئندہ چلکر زمانہ پسند طبائع نے جمشید کا تخت ہی اڑا دیا - یہ بھی ممکن ہے کہ اس بادشاہ کے زمانہ میں راماین کے "پشپک بمان" کی طرح کوئی "اُڑن کھٹولا" یا طیارہ تیار ہوگیا ہو - اس بادشاہ نے بقول فردوسی سات سو برس سلطنت کی - آلات حرب و ضرب - عمدہ عمدہ کھانے اسباب آرائش و آسائش لباس ، شراب اور آلات موسیقی وغیرہ ایجاد کئے - اسی کے زمانہ میں فن تعمیر کی ابتدا ہوئی اور ملک میں عمدہ عمدہ عمارتیں

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۲ کا سلسلہ)

نام قوم بزبان ایرانی	نام بزبان انگریزی	مقام بود و باش
۱- مادہ	Medes.	شمال مغربی ایران
۲- پرسا	Persians.	جنوبی ایران
۳- ورکانا (وواریوس) وہرکانا (ژند)	Hyrcanians.	علاقہ استرآباد
۴- پارتھوا	Parthians.	خوراسان
۵- ہراکوہ یا ہروی	Arians.	وادی دریائے ہری (علاقہ ہرات)
۶- ژرنگا	Darangians.	شمال مغربی افغانستان
۷- ہراوتی	Arachoteans.	نواح قندھار
۸- باختری	Bactrians.	بلخ
۹- صغدی	Sogdians.	ماوراء النہر
۱۰- خوارزمی	Chorasmians.	خوارزم
۱۱- مرغو	Margians.	وادی دریائے مرغاب
۱۲- ساگرتا	Sagartians.	خانہ بدوش
۱۳- دایا	Dahans.	ترکستان

ان قوموں کی مختلف شاخیں ملاکر تیس سے بھی زیادہ ہوتی ہیں - ہر قوم کی زبان مختلف تھی جیسا کہ ہندوستان میں ہے -

۱؎ یہ شہر موجودہ شیراز سے ۳۵ میل کے فاصلہ پر واقع تھا اسی کو اہل یونان پرسی پولس "Persepolis" کہتے تھے ۲؎ اسی بادشاہ نے سن شمسی ایجاد کیا جس میں ۱۲۰ سال بعد ایک ماہ کا اضافہ کر دیا جاتا ہے - سال کا پہلا دن نوروز کہلاتا ہے جو بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے -

بننے لگیں ملکی نظم ونسق کو اُس نے تین صیغوں (مذہبی۔ حربی۔ مالی) میں تقسیم کر دیا تھا۔ زر وجواہر اور زیور کا استعمال بھی اسی بادشاہ کے زمانہ میں شروع ہوا۔

ادبیات فارسی میں اس کے نام سے چند الفاظ آتے ہیں جنکا ذکر لطف سے خالی نہ ہوگا۔

جام جم۔ یہ ایک کروی گیند تھا جس میں اجرام سماوی اور اقالیم ارضی کی تقسیم بذریعہ خطوط ونقوش کی گئی تھی۔ اسی کرہ کے ذریعہ سے یہ بادشاہ آئندہ کے متعلق پیشین گوئی کیا کرتا تھا۔

جشن نوروز۔ جس روز آفتاب عالم تاب برج حمل میں آتا ہے۔ اس روز فصل بہار کا پہلا دن ہوتا ہے۔ ایران کی تمام سرزمین کثرت گل وریاحین سے ارژنگ چین بنجاتی ہے۔ اسی خوشی میں یہ جشن نوروز منایا جاتا ہے۔ یہی دن تقویم شمسی کے اعتبار سے ایرانی سال کا پہلا دن ہوتا ہے یہ بھی گویا انجم پرستی کا ایک پر لطف ڈھنگ ہے جسکو اکبر اعظم نے ہندوستان میں بھی زندہ کرنا چاہا تھا۔

جمشید کی سطوت وجلالت کی جب یہ نوبت پہونچی تو غرور ونخوت نے دماغ خراب کر دیا خدائی کا دعویٰ کر بیٹھا۔ بالآخر جمشید ضحاک کے ہاتھ سے قتل ہوا اور آناً فاناً اس کے دم کے ساتھ اس کی خدائی بھی مٹ گئی۔

اژدھاک

جمشید کو قتل کر کے تاج وتخت ایران کا مالک ضحاک بن بیٹھا۔ مگر اس نے یہ غلطی بہت بڑی کی کہ رعایا کی تالیف قلوب سے کام نہ لیا۔ بلکہ ملک پر فوجی حکومت شروع کر دی۔ جس نے ذرا سر اٹھایا فوراً کچل دیا نسل کیانی کا بچہ بچہ ڈھونڈھ کر اس نے قتل کیا اور آخر اس ظلم وستم کی وجہ سے اس کا لقب "ضحاک ماراں" ہوا بقصہ کہانیوں میں لکھا ہے کہ اس بادشاہ کے شانوں پر دو سانپ تھے جنکی خوراک دو آدمیوں کا بھیجہ تھی۔ یعنی بادشاہ کم از کم دو آدمیوں کو روز قتل کر ڈالتا تھا۔

آخر ضحاک کا ظلم رنگ لایا۔ فرعون کے لئے قدرت نے ایک موسیٰ کا سامان پیدا کر دیا۔ جب اس نے کیانیوں کا قتل عام کرنا شروع کیا، تو لوگوں میں بےچینی پیدا ہونے لگی۔ کیانی خاندان کی ایک خاتون جو حاملہ تھی ضحاک کے ہاتھوں بچکر بھاگی اور کوہستان میں جا کر پناہ گزیں ہوئی۔ وہاں اس کے پیٹ سے ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام فریدوں رکھا گیا۔ خاتون کی ماری ماں کی چھاتیوں میں دودھ کہاں تھا۔ بچہ کو ایک گائے کے دودھ پر لگا دیا۔ جس کا نام فارسی علم ادب میں مایہ۔ مایون۔ برمایہ آتا ہے۔ جو لوگ ضحاک کے ظلم وستم سے نالاں تھے وہ فریدوں کو خاندان کیانی کا چشم وچراغ سمجھ کر جمع ہونے لگے۔ کاوہ آہنگر جس کے دو بیٹے ضحاک کے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے اس گروہ کا سرغنہ تھا۔ اور اسی کے ذریعہ سے سامان حرب وضرب مہیا ہوتا تھا۔ جب یہ جماعت بڑھتے بڑھتے طاقتور ہو گئی۔ تو سلطنت کو ان کی طرف سے اندیشہ پیدا ہونے لگا۔ ضحاک نے فریدوں کے خلاف فوجکشی کی۔ فریدوں کی ماں اور فریدوں تو بھاگ کر روپوش ہو گئے برمایہ گائے رہگئی چونکہ فریدوں اسی کے دودھ سے پرورش ہوا تھا اس لئے ضحاک نے اس گائے کو قتل کر دیا۔ اس

گاؤکشی نے سحر سامری کا کام کیا۔ گو سالہ پرستوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگی۔ کاوہ آہنگر نے ایسی چال کھیلی کہ لوگ دیوانے ہو گئے۔ یعنی اُس نے مقتول گائے کی کھال لیکر اس کا جھنڈا بنایا اور فریدوں کے سر پر بلند کر دیا خوب جوش پھیلا ضحاک سے جنگ ہوئی۔ فریدوں کو فتح ہوئی اور ضحاک مارا گیا کہتے ہیں کہ ضحاک نے ایک ہزار برس سلطنت کی تھی۔

فریدوں کی اس فتح سے گائے کی عظمت ملک میں بڑھ گئی۔ اور وہی جذبہ آج تک ہندوستان میں موجود ہے "درفش کادیانی" وہی جھنڈا تھا جو کاوہ آہنگر نے بر مایہ گائے کے چمڑے سے بنایا تھا۔ اس واقعہ کے بعد یہ درفش کاویانی خزانہ شاہی میں رکھا گیا۔ جو بادشاہ تخت نشین ہوتا تھا وہ اس کے جواہرات میں اضافہ کر دیتا تھا۔ یہ جھنڈا بجز سپہ سالار کے اور کوئی نہیں اٹھاتا تھا۔ اور بوقت جہاد نکالا جاتا تھا۔ بالآخر یہ درفش عربوں کے ہاتھ آیا۔ اور اس کے ساتھ ہی قدیم سلاطین ایران کا چراغ گل ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ اس علم پر کروڑوں روپیہ کے جواہرات نصب تھے۔ جنھیں عربوں نے آپس میں تقسیم کر لیا اور یہ عجیب و غریب شے دنیا سے ناپدید ہو گئی۔

الغرض جنگ فریدوں و ضحاک کے بعد گائے کی اس قدر عظمت بڑھی کہ بادشاہوں کا نام بھی گاؤ یار رکھا جانے لگا گائے کے نام اور صورت کی بہت سی چیزیں ایجاد ہوئیں اور سنگیں چنانچہ فارسی کی کتابوں میں گرز گاؤ سر کا نام اب تک چلا آتا ہے۔

فریدوں ضحاک کو قتل کرنے کے بعد فریدوں بادشاہ ہوا اور عرصہ تک داد جہانبانی دیتا رہا فریدوں کے تین بیٹے تھے سلم۔ تور۔ ایرج۔ چھوٹے بیٹے ایرج سے فریدوں کو زیادہ محبت تھی۔ جب بڑھاپا آیا تو اس خیال سے کہ کہیں اس کے بعد بھائیوں میں خانہ جنگی نہ ہو تمام سلطنت تینوں بیٹوں میں حسب طریقہ ذیل تقسیم کر دی گئی:۔

۱- ماوراءالنہر اور وسطی ایشیا	تور کو	اسی وجہ سے اس ملک کا نام توران ہوا
۲- چین و ماچین	سلم کو	....
۳- ہندوستان اور ایران	ایرج کو	بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایرج کے نام پر اس ملک کا نام ایران ہوا

باپ کی یہ تقسیم دونوں بڑے بھائیوں کو پسند نہ آئی۔ دونوں نے ملکر سازش کی۔ اور فوجکشی کر کے ایرج کو مار ڈالا غضب یہ کیا کہ ایرج کی لاش باپ یعنی فریدوں کے پاس بھجوا دی۔ جس کے صدمہ سے بیچارے بوڑھے باپ کی کمر ٹوٹ گئی

منوچہر ایرج کے بعد اس کا بیٹا منوچہر بادشاہ ہوا اور فوراً لشکر جمع کر کے تور و سلم کی طرف بڑھا چچا بھتیجہ میں جنگ ہوئی۔ منوچہر کو فتح ہوئی اور اس نے تور و سلم دونوں کے سر کاٹکر اپنے دادا فریدوں کے پاس بھجوا دئے۔ اس وقت سے ایران اور توران کے درمیان جنگ و جدال کی ابتدا ہوئی۔

منوچہر کے بعد کیقباد۔ کیکاؤس اور کیخسرو ہوے اور ان سب کی عمریں توران سے لڑتے گذریں۔ اسی زمانہ

میں نریماں - سام - زال - رستم - افراسیاب - ہوئے اور افراسیاب کی موت سے ایران و توران کی خانہ جنگی کا خاتمہ ہوگیا -

قتل افراسیاب کے بعد کیخسرو تارک الدنیا ہوکر گوشہ نشین ہوگیا - اور اس کا داماد لہراسپ بادشاہ ہوا - اسکے بعد گشتاسپ ہوا اور اسی زمانہ مین زرتشت کا ظہور ہوا اور اسی زمانہ میں رستم کے ہاتھ سے ولیعہد ایران اسفندیار اور اپنے سوتیلے بھائی شغاد کے ہاتھ سے رستم قتل ہوا -

ہفتخواں رستم و اسفندیار - نوشدارو پس از مرگ سہراب - چاہ بیژن منیزہ - خون سیاوش - پر سیاوشاں سیمرغ - کوہ قاف - وغیرہ کی اصطلاحیں ادبیات ایران میں اسی زمانہ کی یادگار ہیں -

گشتاسپ کے بعد بہمن دراز دست - پھر داراب پھر اس کا بیٹا دارا بادشاہ ہوئے -

دارا

اس نے عرصہ تک نہایت شان و شوکت کے ساتھ سلطنت کی - اس وقت ایران اور یونان میں سخت رقابت تھی اور دولت مندی اور آرام طلبی نے ایرانیوں کی طاقت کو گھن لگا دیا تھا سکندر یونانی نے فوجکشی کی دارا قتل ہوا اور اسی کے ساتھ سطوت کیانی بھی ختم ہوگئی - مگر ادبیات فارسی کی بدولت صولت اسکندریہ دبدبۂ سکندری - حشمت دارا کی اصطلاحیں دنیا میں باقی رہگئیں -

اردشیر بابکاں

قتل دارا کے بعد ایران و توران پر یونانیوں کا تسلط ہوگیا - مگر سکندر کی وفات کے بعد ملک میں طوائف الملوکی قایم ہوگئی - اسی زمانہ میں ملک پارتھیا کے لوگوں نے جن کو اشکانی کہتے ہیں خروج کیا اور تاج و تخت ایران کے مالک بن بیٹھے - اس خاندان کا آخری بادشاہ اردوان تھا جو اردشیر بابکاں کے ہاتھوں ہلاک ہوا - چونکہ اردشیر ایک شخص ساسان کی نسل سے تھا - اس لئے اس جا بد خاندان سلاطین کا نام ساسانی ہوا - یہی وہ سلاطین عجم ہیں جن کو اہل عرب "اکاسرۂ عجم" کہتے ہیں کاخ کسریٰ کی اصطلاح اسی زمانہ سے تعلق رکھتی ہے

شاپور

اردشیر کے بعد اس کا بیٹا شاپور ہوا - اس نام کے سیکڑوں پارسی اس وقت بھی ہندوستان میں موجود ہیں یہ بادشاہ بہت جلیل القدر تھا - اُس نے ایک جنگ میں قیصر روم کو شکست دی جس کی یادگار نقش رستم اور خرابۂ شاپور[1] کے کتبے ابتک موجود ہیں - اسی زمانہ سے ساسانی بادشاہ خود کو "ظل اللہ" اور "خلیفۃ اللہ فی الارض" کہنے لگے تھے مگر بادشاہ خود تو مٹ گئے لیکن ان کی ایجاد کردہ اصطلاحیں ابتک باقی ہیں -

---

[1] نیشاپور، مرکب ہے نے اور شاپور سے - نے بمعنی کلک یا بانس اور شاپور بادشاہ کا نام - چونکہ عہد شاپور سے قبل یہاں بڑا نیستاں تھا اور شاپور نے یہاں آبادی قایم کی اس لئے اس کا نام نیشاپور ہوگیا -

اسی شاپور کے زمانہ میں مانی نے دعوی ٰ نبوت کیا - اس کا خط نہایت اچھا تھا - تصویر کشی اس کا معجزہ قرار پایا مانی و بہزاد کی اصطلاحیں زبان میں اب تک موجود ہیں -

ہرمزد

شاپور کے بعد اس کا بیٹا ہرمزد تخت نشین ہوا - رام ہرمزد اسی کی یادگار ہے - اس کے بعد بہرام ہوا یہ خاندان عرصہ تک حکمرانی کرتا رہا - حتی کہ کوادیا قباد کا زمانہ آیا اور مزدک کا ظہور ہوا سوشلزم یا اشتراکیت کا موجد یہی ہے -

قباد کے بعد اس کا بیٹا نوشیرواں تخت نشین ہوا جس نے تمام مزدکیوں اور عیسائیوں کو تہ تیغ کیا - قیاصرہ روم سے بھی اس کی لڑائیاں ہوئیں - عدل و داد کی وجہ سے ادبیات میں اس کا نام اب تک نوشیرواں عادل مشہور ہے - اسی کے زمانہ میں پیغمبر اسلام کی ولادت ہوئی -

نوشیرواں کے بعد انوشہ زاد تخت نشین - پھر ہرمزد چہارم ہوا - جس کے ظلم و ستم سے ساسانیوں کی سلطنت کو بیحد ضعف پہونچا -

اس کے بعد خسرو پرویز کی باری آئی - شیریں - خسرو - فرہاد، کوہ بے ستون - جوئے شیر - تیشۂ فرہاد - کوہکن وغیرہ اسی زمانہ کی یادگار ہیں -

خسرو پرویز کو اس کے بیٹے شیرویہ نے قتل کردیا اسی زمانہ میں ایران کو طاعون نے تباہ و برباد کیا - اس کے بعد ایک ہفت سالہ لڑکا بنام اردشیر تخت نشین ہوا جس کو ہرماز نے قتل کردیا - پھر پرویز کی بیٹی پوران دخت تخت پر بیٹھی - اس کے بعد پیروز ہوا - اس کے بعد اس کی بہن آرزم دخت تخت نشین ہوئی ساسانیوں کا آخری بادشاہ یزدجرد سوم ہوا جو مسلمانوں کے ہاتھوں غریب الدیار ہوکر ہلاک ہوا -

ایران قدیم کی زبانیں

صفحات ماقبل میں عرض کیا جاچکا ہے کہ سرزمین رستم و اسفندیار کا اصلی نام زمانہ قبل تاریخ میں کچھ اور تھا - مگر جب "آریا" نامی ایک زبردست اور طاقتور قوم باہر سے آکر ملک پر تسلط ہوگئی تو اس نے ملک کا نام اپنے نام پر "آریان" رکھا - یونان کی قدیم کتب میں اس ملک کا نام "پرسیس" (Persis) پایا جاتا ہے - جو درحقیقت "فارس" اور ایران کا ایک مشہور صوبہ ہے - الغرض آریا قوم نے ملک کے اصلی باشندوں کو جن کا نام معلوم کیا ہوگا - مگر جن کو آریا لوگ "دیو" کہتے تھے، گنجان جنگلوں اور دشوار گذار پہاڑوں میں مار بھگایا - اس سے ثابت ہوتا ہے

ف ایرانیوں کے علاوہ ملک ایران میں بہت سی غیر آریہ قومیں بھی پائی جاتی تھیں جنھیں "انا ریہ" (اناڑی غالباً اسی سے نکلا ہے) یعنی غیر آریہ اقوام کہا جاتا تھا - ان میں تاپوری - امردی - قرزبی - گیلانی - ارمن اور تفقازی - زیادہ مشہور تھیں - جنوب میں کرمانی اور جنوب مغرب میں ایلامی رہتے تھے - علاوہ ازیں توران اور مشرقی ایران کے (ملاحظہ ہو بقیہ نوٹ صفحہ ۳۸ میں)

کہ ایران کی اصلی زبان جو کچھ بھی ہوگی وہ انہی "دیووں" کی زبان ہوگی۔

ایران میں قومی زبان کی ابتدا

توریت میں "مینار بابل" کا واقعہ خواہ اساطیر الاولین سمجھا جائے یا داستان پاستان۔ مگر اس سے ابتدا، تمدن انسانی کے متعلق حسب ذیل باتیں ضرور معلوم ہوتی ہیں:-

۱- دنیا میں بہت سی متمدن قومیں موجود تھیں۔

۲- نظام ملوکیت کی ابتدا ہو چکی تھی۔ اور جتنے آدمی مینار بابل کی تعمیر میں لگے ہوئے تھے ان میں زیادہ تر مفتوح ومغلوب اقوام کے لوگ تھے جن کو غلام بنا لیا گیا تھا۔ اہرام مصری کی تعمیر بھی اسی طرح ہوئی تھی۔

۳- جس واقعہ کو توریت میں لفظ بیبل ([illegible]) سے بیان کیا گیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ قہر خداوندی کی وجہ سے لوگوں کی زبانیں بدل گئی تھیں۔ اور وہ ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے تھے۔ اس میں استعارۃً یہ بات ظاہر کی گئی ہے کہ تعمیر مینار بابل میں مختلف اقوام وملل کے لوگ مصروف تھے جو اپنی اپنی مختلف زبانیں بولتے تھے ان مغلوب اقوام وملل میں بیداری پیدا ہوئی۔ ملوکیت کے خلاف ہر طرف شورش پیدا ہوگئی۔ لوگ مختلف الخیال ہوگئے بالآخر ملوکیت کا شیرازہ درہم برہم ہوگیا۔ اور مختلف قومیں مختلف سمتوں کی طرف چلی گئیں۔

۴- ایران بابلستان سے ملا ہوا ہے۔ لہذا جو قوم بابل سے چل کر ایران پر متسلط ہوئی وہ نہایت متمدن اور فن تعمیرات وغیرہ سے واقف تھی۔ اسی قوم کا سردار جو پیشدادیاں ایران کا پہلا تاجدار کہلاتا ہے۔ کیومرث تھا۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ قدیم اقوام ایران جن کو کیومرث اور اس کے بعد طہمورث دیو بند نے مغلوب کیا۔ وہ جنگلوں اور پہاڑوں کے غاروں میں رہا کرتی تھیں۔ اور جانوروں کی کھالوں سے اون کی تن پوشی ہوتی تھی۔ ان اقوام کو مطیع بنانے کے بعد جب امن وامان ہوا تو طہمورث کے بیٹے جمشید نے ایران میں بابلی تمدن کی بنیاد ڈالی۔ شہر استخر بسا کر اپنا پایہ تخت قائم کیا اور اس کا نام اپنے نام پر تخت جمشید رکھا۔ ملک میں امن وامان قائم ہوتے ہی تمدن کی برکتیں نازل ہونا شروع ہوگئیں عمدہ عمدہ مکانات تعمیر ہونے لگے۔ نئے نئے آلات جنگ ایجاد ہوئے مکانات کی آرائش وزیبائش کے لئے عمدہ عمدہ فرنیچر تیار ہونے لگا۔ نفیس کھانے ایجاد ہوئے۔ سامان عیش وطرب مہیا ہوگیا۔ نظام سلطنت کے قوانین مدون ہوئے۔ تین محکمے مذہبیہ۔ حربیہ اور مالیہ قائم ہوئے۔ جسمانی آرائش وزیبائش کے لئے زر وجواہر کا استعمال شروع ہوگیا۔ اور وہ چیز بھی ایجاد ہوئی جس کو عرف عام میں شراب کہتے ہیں۔ اسی واقعہ کو غالب نے اس شعر میں یاد دلایا ہے

(ملاحظہ ہو بقیہ نوٹ صفحہ ۳۷) خانہ بدوش قبائل بھی تھے جو صلح پسند ایرانیوں پر حملے کیا کرتے تھے، اسی لئے ان لوگوں کو ایرانی "ڈہاہ" "ڈاتا" - "ڈاؤ" (دشمن - ڈاکو) یا "دیو" کہا کرتے تھے۔

میراث جم کرے بود اینک بمن بیار زیں پس رسد بہشت کہ میراث آدم است

جمشید کے باپ طہمورث دیو بند نے قدیم ایران کی تمام اقوام و ملل کو مغلوب کرکے بنیاد ڈالی ان کی جان بخشی کی شرط یہ قرار پائی کہ وہ آریا قوم کو اپنی اپنی مختلف زبانیں اور رخط وکتابت کے طریقے سکھلا دیں۔ یہیں سے گویا ایران میں ایک قومی اور ملکی زبان کی بنیاد اسی طرح قائم ہوئی جیسے ہندوستان میں مفتوح اقوام کی بھاشا اور فاتح اقوام کی عربی وفارسی کے اختلاط سے اردو نے جنم لیا۔

مثل مشہور ہے کہ "تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے" اس کی نہایت عمدہ مثال ایران اور ہندوستان کے ایک واقعہ سے ملتی ہے۔

ایران میں کیومرث نے شاہان پیشدادی کی بنیاد قائم کی تو ہندوستان میں ظہیر الدین بابر نے سلطنت چغتائیہ کا علم بلند کیا۔ ایران میں کیومرث کے بعد طہمورث دیو بند کی تمام عمر دیووں کو مغلوب کرنے میں گزری اور بالآخر اس کے عہد میں ایران پر آریا قوم کا پورا پورا تسلط قائم ہوگیا۔ اسی طرح ہندوستان میں نصیر الدین ہمایوں کی تمام عمر جنگ وجدال میں گذری اور بالآخر وہ بھی مغلیہ سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔ ایران میں طہمورث دیو بند کے فرزند رشید جمشید نے بابلی تمدن کی بنیاد ڈالی جو رفتہ رفتہ قدیم ایرانی تمدن کے اختلاط سے ایران کا قومی تمدن بنگیا۔ اسی طرح ہندوستان میں ہمایوں کے فرزند جلال الدین محمد اکبر اعظم کے زمانہ میں ہندو اور چغتائی تمدن کے اختلاط سے ہندوستان میں ایک خاص قومی تمدن قائم ہوا جو آج تک نظر آرہا ہے۔ جس طرح جمشید کے زمانہ میں مختلف قسم کی ایجادیں ہوئیں اسی طرح ہندوستان میں بعہد اکبری مختلف اختراعات وجود میں آئیں ادھر تخت جمشید قائم ہوا تو ادھر اکبر آباد کی بنیاد پڑی۔

جس طرح جمشید کے زمانہ میں ایک قومی زبان قائم ہوگئی تھی اور مختلف الفاظ اور اصطلاحات وجود میں آگئی تھیں اسی طرح ہندوستان میں اکبر اعظم نے زبان اردو کو چار چاند لگائے۔ شراب کا نام۔ رام رنگی۔ پاخانہ کا نام صحت خانہ رکھا۔ رنگترہ۔ بالائی۔ جھروکہ درشن۔ اکاس دیا۔ وغیرہ سیکڑوں اصطلاحیں اس زمانہ میں وضع ہوئیں اور مرگئیں۔ اسی طرح جمشید کے زمانہ میں بھی ہزارہا اصطلاحیں اور الفاظ وجود میں آئے ہونگے مگر افسوس ان سب کا خاتمہ ہوگیا۔ اب اکثر فارسی میں صرف دو اصطلاحیں جمشید کے زمانہ کی پائی جاتی ہیں۔ یعنی جام جم اور جشن نوروز۔ ان دونوں کی تشریح ہم باب ماسبق میں کرچکے ہیں۔ مگر یہاں اس قدر لکھنا غالباً لطف سے خالی نہ ہوگا کہ اگرچہ جام جم بالکل دوسری چیز تھی۔ مگر شعراء نے اس کو ساغر شراب کے معنے میں لے لیا۔ شاید اس لئے کہ جس طرح جمشید اپنے جام یا کروی گیند سے ساری دنیا کا حال معلوم کرلیتا تھا اسی طرح جام شراب پینے کے بعد حجابات عالم دور ہوجاتے ہیں۔

مذہب کا اثر زبان اور تمدن پر

دنیا جانتی ہے کہ مشرق کی زندگی کے ہر شعبہ کا انحصار مذہب ہے - اہل مشرق کی کوئی بات مذہب سے خالی نہیں ہوتی - اور مذہب کی بنیاد پر ان کے تمدن و تہذیب کا قصر تعمیر ہوتا ہے - اور مذہب کے ہی زیر اثر اقوام کی زبانوں اور ان کے علم ادب میں تغیر و تبدل ہوتا ہے۔

یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ ایرانیوں اور ہندوؤں کے آباؤ اجداد ایک ہی نسل سے تھے۔ قدیم ہندوؤں میں تمام آبادی چار ورن پر تقسیم ہوتی تھی۔ یعنی برہمن۔ کشتری۔ ویش۔ شودر۔ اسی طرح ایران کے مہ آبادیوں میں آبادی کے چار طبقات ہوتے تھے۔ یعنی کار توزی یا مقتدایان دین وزاہدان گوشہ نشین نیساری یعنی افسران عسکری نسودی یعنی آرام طلب یا سختی نہ برداشت کرنیوالے لوگ۔ اہنوخوشی۔ جفاکش یا سختی برداشت کرنے والے مہ آبادیوں کے بعد جب ایران میں پیشدادیوں کا دور دورہ ہوا تو وہ چار برن یا طبقات آبادی تو بدستور قایم رہے مگر زبان کے لحاظ سے ان کے نام یہ ہو گئے :-

آسورنی یعنی علمائے دین۔ آرتشتار یعنی سلاطین اور سپاہی پیشہ۔ استرہوش یعنی زراعت پیشہ۔ ہوتخش یعنی مزدور وغیرہ۔

ادبیات فارسی میں ان طبقات کے نام اب تک موجود ہیں چنانچہ قاآنی اپنے قصیدہ کے ایک شعر میں لکھتا ہے

نفس نامی خود نسودی نیست بل اہنوخوشی ست
صبحہا بیں تازہ حرفت چال می آورد

مورخین یونان کی کتابوں میں آرتازرکسیز۔ کار رانگ ارتخشتر۔ اور اردشیر بابکاں کے نام میں وہی قدیم پیشدادی ورن آرتشتار کا مادہ موجود ہے۔ کارکنان قضا و قدر جن کو عربی زبان میں ملائکہ کہتے ہیں وہی قدیم ایرانی زبان میں فرشتہ کہلاتے تھے۔ مگر حیرت ہے کہ وہی دیو جس کو ایران میں برا سمجھا جاتا تھا، ہندوستان میں دیوتا بنا دیا گیا۔ چنانچہ لفظ جہادیو میں دیکھیے کہ وہی ایرانی دیو موجود ہے مگر افسوس ہے عرب کے "عفریت" پر کہ یہ کمبخت ہندوستان میں آکر بھی "پریت ہی بنا رہا"[ا]

قدیم مصریوں اور بابلیوں کی طرح قدیم ایرانیوں میں بھی اجرام سماوی کی پرستش ہوتی تھی اور ان کی مورتیاں بنا کر جگہ جگہ مندر یا عبادت خانے تعمیر کئے گئے تھے۔ تاج و تخت کے ساتھ سلاطین ایران ماہ و مہر کی بھی قسم کھایا کرتے تھے چنانچہ فردوسی نے سہراب کے قصہ میں لکھا ہے ؎

[ا] عربی کا "عفریت" بھی ایرانی زبان سے آیا ہے جو ہندوستان میں "پریت" کہلاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ قدیم ایرانی زبان میں اسے پلید کہتے ہوں جو عرب میں عفریت اور ہندوستان میں پریت بن گیا۔

لفظ	معنی	لفظ	معنی
آذرگشسپ	بجلی	آستی	آستین
چاک	سپیدۂ صبح	چاک چاک	تلوار مارنے کی آواز
آغاز	ارادہ	چرنگ	آوازِ گرز
افسوس	ظلم و ستم	چک Cheque	قبالہ۔ دستاویز
شارسان	شہر و شہرستان	الوشہ	آفریں
شبگیر	صبح	بادسر	مغرور
بارگی و بارہ	اسپ	باژ	خراج
غُرم	پہاڑی بھیڑ	غرچہ	مخنث۔ نامرد
غو	خروش	گو	پہلوان
پسیج	ارادہ۔ کارسازی	بگماز	شراب
پازہر	تریاق	فیلہ	گلۂ اسپان
پذیرہ	استقبال کرنا	فش	دم و یال اسپ
پدرام	آراستہ	قارورہ	یکے از آلاتِ جنگ
پہلوانی	پہلوی زبان	خشت	چھوٹا نیزہ
دبوس	گرز	درع	پیراہن زناں
درخت	دارالسیاست	درقہ	چمڑے کی ڈھال
ستادہ	خیمہ	دستار	دسترخوان
ستارہ	مہری	دست بند	زنان رقاص
ستودان	دخمہ	دست حابہ	جامہ سراپا
دست راست	وزیر اعظم	سرسری	فرومایہ
دستوار	عصا	سروں	شاخ گاؤ
سفت	دوش	دمدار	ساقۂ لشکر
شیب	تازیانہ	دواج	لحاف
صُلاب	اصطرلاب	ردہ	صف

عربی	ایرانی	عربی	ایرانی
جنس	مہ گونہ	برہان	روشنگر
فصل	بازآر	برہان تطبیق	برہم روشنگر
خاصہ	ویژ	برہان سلمی	زینہ روشنگر

اصطلاحات فلسفہ

ازل	آغاز نخست	مادہ	سرمایہ
عنصر	گوہر	لاشے	ناچیز
شئے	چیز	وجود	توانائی
زمانہ	روزگار	حرکت	جنبش
یبوست	خشکی	سکون	آرام
قوت	نیروے	قسر	افسردگی
نوع	بخش	متحرک بالطبع	جنبدہ خو
سیال	رادق پذیر	دوران	گشت
تغیّر	فرسودن	فنا	تباہی
متحرک بالارادہ	پویندہ	حرارت	گرمی
برودت	سردی	مائیت	تری

دیگر اصطلاحات مختلفہ

لفظ	معنی	لفظ	معنی
وشیر	خاص	تال وبال	ریزہ ریزہ
مر	شمار	تخش	تیر
ترگ	کلاہ آہنی	ترنگ	کمان کی آواز
آخو	اصطبل	تلاش	پراگندہ
آذین	زینت وآرائش	تنگ آمدن	نزدیک آمدن

عجیب بات ہے کہ دساتیر کی یہ شعر نما یا مقفیٰ عبارت مسلمانوں کے مندرجہ ذیل کلمہ سے کس قدر ملتی جلتی ہے۔

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یورپ کی اکثر زبانوں میں ایران کی قدیم کتب مقدسہ کے ترجمے ہو گئے ہیں - جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابیں الٰہیات - حقائق و معارف - حکمت و اخلاق اور سیاست مدن وغیرہ کی مخزن ہیں اور یہی وہ سونا تھا جس کو عربوں نے تاؤ دیکر کندن بنا دیا

قدیم ایران کی بعض اصطلاحات علمیہ

فتح اسلام کے بعد عربوں کی زبان اور تمدن کا اثر ادبیات ایران پر اسقدر زبردست پڑا کہ فارسی کا باوا آدم ہی نرالا ہو گیا اور وہ گویا خاص مسلمانوں کی زبان بن گئی - مگر جو قدیم ایرانی کتب یورپ کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ایرانی زبان منطق - فلسفہ - فقہ - ادب، وغیرہ کی مصطلحات سے خالی نہیں تھی - ذیل میں چند نمونے دکھائے جاتے ہیں جن سے ہمارے قول کا کافی ثبوت ملتا ہے :-

اصطلاحات حکمیہ

عربی	ایرانی	عربی	ایرانی
عقل اول	نهین ہوش	واجب	بایست
علت	ایرایہ	ممکن	شایست
علت مادی	مایئی	ممتنع	نابایست
علت صوری	پیکری	جوہر	گوہر
علت فاعلی	کاری	عرض	پیان
علت غائی	گرائی	بسیط	آذز
قدیم	باش	مرکب	دربست - کاموس
حادث		رستہ نورستہ	

اصطلاحات منطق

عربی	ایرانی	عربی	ایرانی
نوع	گونہ	دعویٰ	خواست

فقرہ اوستا

اشم وہو وہیستم ہستی اُستا ہماے یداشای دیستای اشم

راستی نعمت کبریائی ہے۔ رحمت ہے اور فراواں ہے۔ اور تقدس سے خیر ترین اشیاء ہے۔ چاہتی ہے کرتی ہے ہوگی۔

عبارت خوردہ اوستا

(صحیفۂ نماز و ادعیۂ ماثورہ)

مس دوہ دفیر دزگرباد مینوے خورشید امرگ رایومند خرہمند

بزرگ دفیر وزمند باد مینوے خورشید بے مرگ خالص نورمند خردمند

اروند اسپ ہمت دہیخت وہورشت۔

توی اسپ بہ نیک نیت نیک گفتار و نیک کردار نماز براں

اس فقرہ کی عبارت کے سیاق سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی شخص کے جنازہ کی نماز ہے۔

نمونہ عبارت وساتیر

ہوزامیم فہمزدان ہزہزماس وزماس ہرشیور ہردیور

پناہم بہ یزداں از منش وخوے بد وزشت گمراہ کنندہ دبراہ بدبرندہ

نہ شید شمتاے ہرشندہ ہرشنگر زمریاں فرہیدور

بنام ایزد بخشایندہ بخشائش گر مہرباں داوگر

(ملاحظہ ہو بقیہ نوٹ صفحہ ۴۴)

سنسکرت	ژند	قدیم فارسی	جدید فارسی
کرتو (بصیت)	خرتو	خرذ	خرد
اسٹرومیدھاس	آہوزدمزداؤ	اوراھزدا	ہرمزد
باہو (بازو)	بازد	.	بازو
ھتا (ہاتھ)	ستا	دستا	دست
جریاس (سمندر)	ذرایو	دریا	دریا

برہمنوں کے مذہب نے کروٹ لی تھی اسی طرح قدیم مہ آبادیوں کے مذہب نے آل ساسان کے پانچویں تاجدار خسرو پرویز کے زمانہ میں کروٹ لی۔ یعنی اس بادشاہ نے بعض قدیم کتب کا جن کا سلاطین پر نازل ہونا خیال کیا جاتا تھا اپنے عہد کی فصیح زبان میں ترجمہ کرایا اور ان کا نام دساتیر رکھا۔ مگر یہ کتابیں مذہب زرتشت کو ایران سے نہ نکال سکیں اور بالآخر مہ آبادی مذہب ایران میں ہمیشہ کے لئے فنا ہوگیا۔ افسوس ان کتابوں کا پتہ نہیں چلتا ورنہ بہت سے راز منکشف ہوتے۔

کتاب ژند چھبیس ابواب پر مشتمل تھی۔ مگر افسوس ہے کہ ان میں سے صرف انیسواں (19) باب جس کو وندیداد کہتے ہیں قائم رہگیا ہے اور باقی تمام ابواب مفقود ہیں۔

زبان کی تدریجی ترقی اور عہد بعہد کے تغیرات دکھانے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایران کی کتب قدیمہ کی عبارتوں کے نمونے دکھائے جائیں۔ اوستا کا فقرہ جو مع ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے یہ ظاہر کرتا ہے کہ زبان پر سنسکرت کا اثر کتنا غالب[لے] ہے

لے تمام ایرانی زبانوں کی وہ امتیازی خصوصیات جو انھیں زبان سنسکرت سے علحدہ کرتی ہیں حسب ذیل ہیں:-

(۱) سنسکرت کا "س" ایرانی میں "ہ" سے بدل جاتا ہے۔ مثلاً

سنسکرت	ژند	قدیم فارسی	جدید فارسی
سندھو۔ (دریا)	ہندو	ہندو	ہند
سَرْوَ (سرب) تمام	ہورو	ہورو	ہر
سَمَہ (تمام)	ہمہ	ہمہ	ہم

(۲) حروف مرکب یا مخلوط کی تبدیلی۔ مثلاً

سنسکرت	ژند	قدیم فارسی	جدید فارسی
بھومی (زمین)	بومی	بومی	بوم
دھیتا (انصاف)	داتا	داتا	داد
گھرم (گرمی حرارت)	اگرما	گرما	گرم

(۳) حروف ک۔ پ۔ ت وغیرہ کی تبدیلی۔ مثلاً

سنسکرت	ژند	قدیم فارسی	جدید فارسی
پرتھما۔ (پہلا)	فرتما	فرتما	فردم (پارسی)

(بقیہ ملاحظہ ہو صفحہ ۲۵)

اسلامیہ سے قبل جو رسم الخط ایران میں رائج تھا غالباً وہ یہی خط تھا۔ ناگپور میں ایک پہاڑی ہے اس کے شمالی مشرقی گوشہ پر پارسیوں کا قبرستان ہے۔ جہاں بہت سی قبریں انگریزی وضع کی بنی ہوئی ہیں ان میں سے اکثر پر تو انگریزی زبان میں کتبے درج ہیں مگر چند پر قدیم فارسی کتبے بھی ہیں۔ یہ خط داہنے سے بائیں کو عربی کی طرح لکھا جاتا ہے اور پرانے خط کوفی سے کسیقدر مشابہ ہے۔ ایک جگہ "ہُوا مزدا" کا لفظ صاف سمجھ میں آتا ہے۔

قدیم ایرانی زبان کے نمونے

فتح توران اور قتل افراسیاب کے بعد جب کیخسرو شہنشاہ ایران تاج وتخت سے دستبردار ہو کر یادِ خدا میں مصروف ہوگیا تو اس کے بعد اس کا داماد لہراسپ تخت نشین ہوا اور اسی بادشاہ سے سلاطین کیانیاں کا دوسرا دور شروع ہوا۔

لہراسپ کے بعد گشتاسپ تخت نشین ہوا۔ اسی کے زمانہ میں زرتشت کا ظہور ہوا اور ایران کا قومی مذہب رفتہ رفتہ قدیم آریا مذہب کے بجائے آتش پرستی ہوگیا۔

مذہب کے پلٹتے ہی ایران کی دنیا پلٹ گئی۔ عجائب پرستی کی ظلمت کا تختہ الٹ گیا۔ ایران کا گوشہ گوشہ حقائق و معارف کے نور سے منور ہوگیا۔ اعتقادات کے ساتھ ہی رسم و رواج۔ تہذیب و تمدن اور زبان و ادبیات میں زبردست تغیر نمایاں ہوگیا۔ اجرام سماوی کی مورتیوں اور گئو پوجا کے بجائے یزداں پرستی ہونے لگی۔ مگر عقیدہ توحید کے ساتھ ہی ایک قسم کا شرک بھی جلی و خفی دونوں طرح سے موجود رہا۔ یعنی جب نور کو یزدان اور ظلمت کو اہرمن کا مظہر قرار دیا گیا تو دن کے وقت نیر اعظم اور رات کے وقت آگ کی پرستش ہونے لگی۔ اس طرح گویا انجم پرستی تو برقرار رہی مگر بت پرستی کی جگہ آتش پرستی نے اختیار کر لی۔

زرتشت کی کتاب مقدس کا نام ژند ہے یعنی سنگ چمقاق کا وہ جزو جس سے آگ نکلتی ہے۔ مگر یہ کتاب بہت مشکل تھی۔ اس لئے علماء دین زرتشت نے اس کی ایک شرح یا تفسیر لکھی جس کا نام پاژند رکھا گیا یعنی چمقاق کا دوسرا جزو جس سے ٹکرا کر آگ نکالی جاتی ہے۔ علماء نے ژند کی شرح تو شوق سے لکھی مگر مشکل یہ ہوئی کہ شرح متن سے بھی زیادہ مشکل ہوگئی۔ اس لئے مجبور ہو کر ایک تفسیر لکھنی پڑی جس کا نام اُستا یا اوستا رکھا گیا۔

مگر بعض محققین کا قول ہے کہ زرتشت کی اصلی کتاب اوستا ہی تھی کیونکہ اس میں ارمنی۔ کلدانی۔ آشوری وغیرہ مختلف زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ اس کے بعد ژند کے نام سے اسی کتاب کی شرح پہلوی زبان میں لکھی گئی۔ ژند کی تفسیر پاژند ہے۔ جس میں خالص پہلوی زبان کے الفاظ ہیں اور غیر زبانوں کے الفاظ شاذ و نادر پائے جاتے ہیں۔

بہرحال جس طرح ہندوستان میں گوتم بدھ کے مذہب کو عہد شہنشاہ اشوک وغیرہ میں فروغ ہوا تھا اسی طرح گشتاسپ اور اسفندیار کے زمانہ میں مذہب زرتشت کو فروغ ہوا۔ اور جس طرح بعد میں ہندوستان کے اندر

کی شادی ہوجاتی تھی۔ اسی طریقہ سے ارجن کے ساتھ دروپدی اور رامچندر جی کے ساتھ سیتا جی کی شادی ہوئی تھی۔ اس مقصد کے لئے قدیم ایران میں بھی ایک جلسہ کیا جاتا تھا جس میں لڑکی کے لئے مناسب شوہر منتخب کیا جاتا تھا۔ اس جلسہ کو ایران میں مردگیران کہتے تھے۔

الغرض مہ آبادیوں کے زمانہ میں ممکن ہے قدیم ایرانیوں کی زبان سنسکرت رہی ہو مگر سلاطین پیشدادیان میں جب طہمورث دیو بند اور جمشید کا زمانہ آیا تو قدیم وجدید زبانوں کے اختلاط سے ایک نئی قومی یا ملکی زبان بن گئی جو کسی قدر سنسکرت زبان سے ضرور مشابہ تھی۔ مگر جس طرح ہندوستان میں ہندی بھاشا اور عربی و فارسی زبانوں کے اختلاط سے ایک جدید زبان "اردو" پیدا ہوگئی اور اس کا رسم الخط نہ دیوناگری رہا نہ عربی بلکہ فارسی بن گیا۔ اسی طرح قدیم ایران میں جب ایک نئی زبان پیدا ہوئی تو اس کا رسم الخط بھی سنسکرت یا دیوناگری نہ رہا بلکہ وہ بن گیا جس کے کتبے اب تک ایران قدیم کے خرابوں میں نظر آتے ہیں۔ یعنی وہ خط جس کو حال کی اصطلاح میں خط میخی یا پیکانی کہتے ہیں۔ اور غالباً شاپور بن اردشیر بابکاں کے زمانہ تک ایران میں یہی رسم الخط جاری رہا۔ نقش رستم اور خرابہ شاپور کے کتبے اسی خط میں ہیں۔

شاپور کے زمانہ میں ایک شخص مانی کا ظہور ہوا جس نے نبوت کا دعوی کیا۔ پہلے شاپور کا بھائی پرویز اور پھر خود شاپور اس کے مذہب میں داخل ہوگئے۔ اب یہ جدید مذہب روزافزوں ترقی کرنے لگا۔ زرتشت کے مذہب نے توحدانیت قائم کرنے کے بعد خدا کی دو قدرتیں ظاہر کی تھیں ایک یزدان یعنی خالق خیر۔ دوسری آہرمینوش یا اہرمن یعنی خالق شر۔ مگر مانی کے مذہب نے نور کو خیر اور ظلمت کو شر قرار دیا۔ اور انھیں دونوں قوتوں کے زیر اثر تمام دنیا کے کاروبار کو بتایا۔ انھی دونوں مذاہب کی وجہ سے ادبیات فارسی میں یزدان اہرمن۔ سیہ روز۔ سیہ بخت سیہ گلیم۔ روشن روز۔ روشن رواں۔ روشن خرد اصطلاحات کا اضافہ ہوا۔

مانی کے مذہب میں پانچ درجے ہیں۔ معلمین (ابنار الرحم) مشمسین[۲] (ابنار العلم) قسیسین[۳] (ابنار العقل)۔ صدیقین[۴] (ابنار ذات غیر مرئی) سماعین[۵] (ابنار ذکاوت) ان پانچوں اصطلاحوں میں سے تین تو فنا ہوگئیں مگر ۲ و ۴ دونوں اصطلاحیں ہندوستان اور ایران میں ابھی تک زندہ ہیں۔ یعنی مانی کا صدیق تو بنی عباس کے عہد میں بگڑتے بگڑتے زندیق بنگیا اور مشمسین کے مشمس کو مصنف صاحب طلسم ہوشربا ہندوستان لے آئے اور اس کو اپنی کتاب میں ساحر مشمس کے نام سے زندہ کر دیا۔

مانی کی تصانیف میں سات کتابیں ہیں۔ چھ سریانی زبان میں اور ایک پہلوی میں جس کا نام شاپورقان ہے۔ مانی نے ایک خاص خط ایجاد کیا تھا۔ جو نہایت اہتمام سے لکھا جاتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے مانی کو مصور سمجھا اور تصویر کشی اس کا معجزہ قرار دیا گیا۔ شاپورقان نامی کتاب اسی جدید خط میں نہایت اہتمام کے ساتھ خوشنما لکھی گئی تھی فتوحات

بدو گفت سہراب کاے خوب چہر   بہ تاج و بہ تخت و بماہ و بمہر

مذہب زرتشت کے بعض علماء کا خیال ہے کہ ممالک عرب پر بھی پہلے ایرانیوں ہی کی حکومت تھی۔ چنانچہ مہ آبادیوں کے باقیات الصالحات میں ابھی تک عرب میں مکہ اور مدینہ کا وجود پایا جاتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک شہر مکہ مہ آبادی ایرانیوں کا آباد کردہ ہے۔ مہ آبادیوں نے وہاں ایک مندر تعمیر کیا جس میں چاند کی مورتی رکھی اور زحل کی یاد میں ایک سیاہ پتھر بھی نصب کیا۔ اس عبادت خانہ کا نام "مہ گہہ" یعنی چندرماں دیوتا کی جگہ رکھا۔ جو کثرت استعمال سے مکہ ہو گیا اور کیوان کا سیاہ پتھر حجر اسود —— اسی طرح انھوں نے لفظ مدینہ کو مہ دینہ بنایا ہے جس کے معنی چاند کی بستی کے ہیں۔ اسی مدینہ سے لفظ مدائن نکلا ہے جو ایران کا پایہ تخت تھا۔ اور جہاں چاند کی مورتیوں کے بہت سے مندر تھے ان کا یہ بھی خیال ہے کہ عرب میں چاند کی دیبی کو منات کہتے تھے۔ ایران میں اسکا کچھ اور نام تھا مگر یہی منات ہندوستان آکر سومنات بن گئی۔

ایران کے مہ آبادیوں اور پیشدادیوں کی رسمیں قریب قریب وہی تھیں جو ہندوستان میں ہندوؤں کی ہیں۔ ہندوستان میں ہولی ہوتی ہے جگہ جگہ آگ جلا کر آتش پرستی کی جاتی ہے۔ اسی طرح ایران میں ایک تیوہار آتش سوز ہوتا تھا جس میں آتشکدے روشن کرکے اگنی دیوتا کی پرستش کی جاتی تھی۔

ہندوستان میں ہولی کے دنوں میں عبیر و گلال چھڑکا جاتا ہے۔ پچکاریوں سے لوگوں پر رنگ ڈالا جاتا ہے اسی طرح قدیم ایران میں رسم آب ریزاں ہوتی تھی جس میں لوگوں پر رنگ پاشی کی جاتی تھی۔

ہندوستان میں دیوالی کا تہوار ہوتا ہے۔ مکانات کی صفائی کرکے جگہ جگہ چراغاں کیا جاتا ہے' اسی طرح قدیم ایران میں ایک تہوار بنام چراغان روز اسفند ہوتا تھا۔ ادبیات فارسی میں اس کا ذکر اب تک آتا ہے۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے کہ ؎

سیاہ روز شدم بہر عشرت دگراں   دریں زمان چراغان روز اسفندم

ہندوستان میں جس طرح ایک تہوار بسنت منایا جاتا ہے اسی طرح قدیم ایران میں ایک تہوار ہوتا تھا جس میں زرد پھول توڑے جاتے تھے۔ اس کو جشن گل کوبی کہتے تھے۔ فارسی ادبیات میں یہ جشن ابھی تک موجود ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے ؎

خدائیگاں جمال و خلاصۂ خوبی   بہ باغ حسن درآمد بہ رسم گل کوبی

مسلمانوں کے آنے سے قبل ہندوستان کے راجاؤں مہاراجاؤں اور امراء میں ایک رسم تھی کہ جب لڑکی جوان ہو کر شادی بیاہ کے قابل ہو جاتی تھی تو اس کی شادی کے لئے ایک جشن برپا کیا جاتا تھا جس کو سوئمبر کہتے تھے۔ بعض اوقات کوئی شرط بھی رکھ دی جاتی تھی اور جو شخص اس رسم کو پورا کر دیتا تھا اسی کے ساتھ اس لڑکی

لفظ	معنی	لفظ	معنی
طبرخوں	بید سرخ	رزمہ	بقچہ
طغرل	شکاری پرندہ کی ایک قسم	قرطہ	کُرتہ
رنج	رنگ	کالوشہ	دیگچہ
روزبان	دربان	کشکین	جو کی روٹی
روسپی	فاحشہ	ریدک	غلام - امرد
کفچ	تھوک	کلاک	کمان
ریمن	مکار	کنارنگ	بزرگ قوم
کند آور	پہلوان	زخم	عمارت
زمزم	کلمات مغاں کہ وقت پرستش گویند	گردگاہ	کمر
زمی	زمین	گریغ	گریز
زینہار خوردن	عہد شکنی	گشن	بسیار
زوار	خادم زندانخانہ	مزیح	طعنہ وظرافت
سان	عرض لشکر	مہت	گراں
دیلہ	نعرہ	ہرکارہ	دیگ سنگی
رخ	صف لشکر	نیو	پہلوان
ہوش	جان	وان	نگہبان
دیر	یادوفہم	نبشک	جانور درندہ

ایران کے جنگی باجے

بتیرہ - گاؤدم - خرمہرہ - کوس - طبل - نقارہ - کرنائے - سرغین

اسلحہ جنگ

زرہ - جوشن - مغفر - چار آئینہ - خفتان - ترک - ببر بیان - برگستوان

آلات وسامان جنگ

گوپال - گرز - تیغ - سپر - درفہ - خنجر - ژوبین - ناوک - خشت - تیر - خدنگ - کمند - سنان - نیزہ - ژوپن - پرتاب - تبرزین - دبوس - قارورہ - شراع - عرّادہ - رایت - علم - درفش - اختر - سراپردہ -

ترتیب فوج

قلب - میمنہ - میسرہ - طلایہ - ساقہ - دمدار -

نظامِ سلطنت

ملک وقوم میں سب سے بڑا شخص بادشاہ ہوتا تھا جس کی بیحد تعظیم وتکریم کی جاتی تھی - بادشاہ نہ صرف درجہ ومرتبہ میں افضلیت رکھتا تھا بلکہ نیک نیتی اور نیکوکاری میں بھی اس کو فوقیت حاصل ہوتی تھی - اختیارات میں بادشاہ مطلق العنان ہوتا تھا - اگرچہ ملک کے لئے آئین وقوانین مقرر ہوتے تھے - مگر بادشاہ کا ہر حکم قانون سمجھا جاتا تھا اہل دربار اور رعایا بادشاہ وسلطنت کی بیحد تعظیم کرتے تھے - حتیٰ کہ کوئی شخص بادشاہ کی جھوٹی قسم نہ کھاتا تھا - اور جو ایسا کرتا تھا اس کو برادری سے باہر کر دیا جاتا تھا - بادشاہ کے بعد اہم ترین شخصیت وزیر کی ہوتی تھی - یہ شخص سب سے بڑا مہندس اور حکیم ہوا کرتا تھا - تمام سرکاری محکمے اور عہدیدار اس کے ماتحت ہوتے تھے -

وزیر کے خاص ماتحتوں میں دو استوار یعنی امین لوگ ہوتے تھے - ان کے علاوہ دو وقائع نویس جن کو اصطلاح میں شندہ بند کہتے تھے - یہ وزیر کے خاص مددگاروں میں ہوتے تھے - ملک کے واقعات سے باخبر رکھنے کے لئے ایک محکمہ خبر رسانی بھی قائم تھا - اور جو لوگ خبر رسانی کی خدمت انجام دیتے تھے ان کو اصطلاح میں رَوَند کہتے تھے -

فوج میں تمام سپاہ کا سردار اعلیٰ خود بادشاہ ہوتا تھا - اس کے بعد جو شخص ایک لاکھ فوج پر سردار ہوتا تھا اس کو سپہبُد کہتے تھے - اس کے نیچے ایک ایک ہزار فوج کے سردار ہوتے تھے جن کو سرہزار کہتے تھے - پھر اُنکے نیچے سو سو سپاہیوں کے سردار ہوتے تھے - جن کا نام سپہدار ہوتا تھا - ان کے نیچے دس دس آدمیوں کے افسر ہوتے تھے جو سالار کہلاتے تھے -

ہر شہر میں ایک کوتوال ہوتا تھا جس کو فرہنگ روز کہتے تھے - یہ شہر میں محکمۂ سراغ رسانی اور وقائع نگاری کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا -

محکمہ فوجداری کا افسر اعلیٰ فرہنگ دار کہلاتا تھا - اور محکمہ دیوانی کے افسر اعلیٰ کو دادستان کہتے تھے علماء دین کے فتویٰ کے بغیر بادشاہ کو بھی سزائے موت دینے کا اختیار حاصل نہ تھا -

آب وہوا اور ماحول کا اثر زبان پر

مذہب کے بعد دوسری چیز جس کا زبان پر زبردست اثر پڑتا ہے وہ ملک کی آب وہوا اور ماحول ہے۔ لہذا جب تک کسی ملک کے طبعی حالات سے واقفیت حاصل نہ ہو اس وقت تک کسی ملک کے فن انشاء پر پوری طرح نقد و بصر ہونا محال ہے۔ کیونکہ ہر ملک کے فن انشاء کی لطافت۔ نزاکت خیالات اور شیرینی ادا سے وابستہ ہوا کرتی ہے۔ اور استعارات و تشبیہات ملکہ امثال و محاورات سب کے سب طبعی سیاسی اور مذہبی اثرات کے تابع ہوا کرتے ہیں۔

انگلستان چونکہ ایک سرد ملک ہے۔ اس لئے وہاں اکثر کہر محیط رہتا ہے اور جب کبھی آفتاب عالمتاب کا رخ روشن بے پردہ نظر آنے لگتا ہے تو بیحد خوشی منائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی علم ادب میں جوانی کو فصل گرما اور بڑھاپے کو موسم سرما سے تشبیہ دیجاتی ہے۔ یعنی ان لوگوں کے لئے گرمی خوش آیند چیز ہے۔ مگر عرب اور ہندوستان گرم ممالک ہیں۔ یہاں ٹھنڈی چیزیں پسند کی جاتی ہیں۔ مثلاً کسی عرب کو اگر کوئی چیز بلا مشقت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ اسکو غنیمت بارد کہتا ہے یا جسکے دیکھنے سے دل کو راحت ہوتی اس کو قرۃ العین یعنی آنکھ کی ٹھنڈک کہتا ہے۔ ہندوستان میں بھی کسی کو دعا دیجاتی ہے تو کہا جاتا ہے۔ کلیجہ ٹھنڈا رہے۔ کوکھ اور مانگ سے ٹھنڈی رہو۔

خاک پاک ایران فنون لطیفہ کی قابلیت میں سب سے ممتاز ہے۔ شاعری اور نازک خیالی یہاں کا خمیر ہے۔ تمام ملک سرسبز و شاداب ہے۔ کوہستان کے دلفریب مناظر میدانوں کے دلکش سبزہ زار۔ روح پرور ہیں۔ یہاں سال میں چار موسم قرار دیئے گئے ہیں:۔

بہار

اس موسم کی ابتدا ۲۱ مارچ سے ہوتی ہے۔ جاڑوں میں ہر چیز برف کی چادر میں ڈھکی ہوتی ہے۔ نوروز آیا اور برف پگھل کر بہنے لگی۔ شاخیں ہری ہونی شروع ہوئیں۔ آج کلی پھوٹی کل پھول نکل آیا۔ ہوا میں خنکی آفتاب میں ہلکی گرمی غرض عجب پر لطف موسم ہوتا ہے۔ ایران گل و ریاحین کی کثرت سے گلزار ہو جاتا ہے۔ اس موسم نے ادبیات ایران پر جس قدر اثر ڈالا اسی قدر دوسرے موسم کا نہیں پڑا اور یہی وجہ ہے کہ قصائد اور غزلوں اور مثنویوں میں جس قدر تشبیہات بہار کی ہونگی وہ اس قدر کسی اور موسم کی نہ ہونگی۔ اس زمانہ میں بارش کا نام و نشان نہیں ہوتا۔ اس طرح گویا ایران کی بہار ہندوستاں کی بہار سے مختلف ہے۔ ہندوستان کی بہار میں گھٹا اور بارش کا ہونا ضروری ہے

تابستان

اس موسم کی ابتدا ۲۳ جون سے ہوتی ہے۔ برف پگھل پگھل کر دریاؤں میں پانی زور شور سے بہتا ہے، میوے تیار ہو جاتے ہیں۔ کاروبار تجارت رونق پر ہوتا ہے۔ گرمی بازار یا گرم بازاری کا محاورہ اسی موسم کا رہین منت ہے۔ علاوہ ازیں گرمی ہنگامہ۔ گرمی صحبت شعر گرم۔ حسن گرم وغیرہ کا وجود اسی موسم کا نام لے رہا ہے۔

پائیز یہ موسم ۲۳ ستمبر سے شروع ہوتا ہے - برف باری ہونے لگتی ہے - کسان لوگ تخم ریزی کر چکتے ہیں - ادہر برف گری اور زمین ڈھک گئی - کاروبار تجارت میں کمی ہونے لگتی ہے -

زمستان اس کا آغاز ۲۱ دسمبر سے ہوتا ہے - برسات کی شدت - اور برفباری کی کثرت سے تمام ملک طبقہ زمہریر بنجاتا ہے - ہر وقت آگ روشن رکھنا ناگزیر ہوجاتا ہے برف باری کے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی آسمان پر سے روئی دھنک دھنک کر نیچے پھینک رہا ہے - تمام کاروبار بند ہوجاتے ہیں - یہیں سے سرد بازاری یا سرد ی بازار کا محاورہ وجود میں آیا اور ایران میں یہ نہایت تکلیف دہ موسم ہوتا ہے -

بڑھاپے میں چونکہ بال سفید ہوجاتے ہیں - انسان کے جسم میں حرارت غریزی کم ہوجاتی ہے - اس لئے بڑھاپے کو انگریزوں کی طرح ایران والے بھی فصل زمستان سے تشبیہ دیتے ہیں -

زبان فارسی کی حقیقت قدرت کی نیرنگی ہے کہ ہر ملک میں بارہ کوس کے فاصلہ پر رسم ورواج - لباس و پوشش لب ولہجہ اور زبان میں کسی قدر تغیر واقع ہوجاتا ہے - پھر کوئی وجہ نہیں کہ ایران جیسے وسیع ملک میں بعض تغیرات کے ساتھ مختلف زبانیں یا ایک ہی زبان مختلف طریقوں سے نہ بولی جاتی ہو چنانچہ ایران کے متعلق کتب لغت اور دیگر پرانی کتابوں میں دیکھنے میں آتا ہے کہ سرزمین ایران میں سات زبانیں رائج تھیں - جو فارسی - دری - پہلوی - ہردی - سگزی - زاولی اور سغدی کہلاتی تھیں - ان میں سے ہردی تو وہ زبان تھی جو ہرات کے علاقہ میں بولی جاتی تھی - سگزی زبان ملک سیستان یعنی زابل کی تھی، سغدی جس زبان کو کہتے تھے وہ سمرقند وغیرہ میں رائج تھی - اور جن ممالک کے نام سے یہ زبانیں موسوم تھیں وہیں تک وہ محدود تھیں - کل ملک ایران کا لنگوا فرینکا ہونے کا شرف ان زبانوں کو حاصل نہیں تھا - بلکہ ایسے سمجھنا چاہئے کہ جس طرح پنجاب والے اپنے گھروں میں اور اپنے آدمیوں کے ساتھ تو پنجابی زبان میں بات چیت کرتے ہیں مگر جب لکھنے بیٹھتے ہیں یا باہر والوں سے گفتگو کرنے پر آتے ہیں تو اردو لکھتے اور بولتے ہیں - الغرض یہ زبانیں مشترکہ نہیں بلکہ مختص المقام زبانیں تھیں - یہی حال ممالک افغانستان کا ہے کہ ملکی زبان پشتو ہے مگر دربار اور خواص کی زبان فارسی

دری اہل یورپ کی تحقیقات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ایران کی قدیم ملکی زبان دری تھی - کیونکہ اس میں غیر زبانوں کے الفاظ اور محاورات داخل نہیں ہیں - نقش رستم دخمرابات استخر میں جو کتبے پائے جاتے ہیں وہ اسی زبان میں ہیں - کیکاؤس - کیخسرو وغیرہ کی زبان یہی تھی - بہر حال اگر ملک کی مشترکہ زبان اگر دری نہیں تھی تو کم از کم ثقات اور دربار کی زبان تو ضرور تھی - افسوس اب اس زبان کا کہیں پتہ نہیں اگر کچھ کچھ نشان ملتا ہے تو ایران کے صوبہ قہستان میں ملتا ہے -

پہلوی محققین کا قول ہے کہ ایران کی مذہبی زبان ہے - اور وہی زبان ہے جس میں زرتشت کی کتاب ژند اسکی

شرح پاژند یا اس کی تفسیر اوستا یا اس کا خلاصہ خورده اوستا لکھی گئی تھیں - مگر بعض کا قول یہ بھی ہے کہ یہ کوئی زبان نہیں تھی بلکہ اس رسم الخط کا نام ہے جو اہل ایران نے ارامی و آشوری اقوام سے حاصل کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایران کی اصلی زبان خالص نہ رہی بلکہ اس میں ارامی - آشوری اور سریانی زبانوں کے بہت سے الفاظ داخل ہوگئے اور زبان بالکل مخلوط ہوگئی - الغرض یہ وہ زبان ہے جو دری کے بعد کی ہے - آج کل پُرانی فارسی کا جو کچھ ذخیرہ پارسیوں کے یہاں یوروپ و ایشیا کے کتب خانوں میں پایا جاتا ہے - وہ سب اسی پہلوی جدید میں ہے -

فارسی محققین کا خیال ہے کہ یہ ایک عجیب الخلقت زبان ہو - بعض کہتے ہیں کہ پہلوی زبان سے اجنبی الفاظ اخراج کرنے کے بعد جو زبان بنی وہ فارسی ہے - مگر بعض محققین کا قول ہے کہ فارسی زبان کوئی خاص زبان نہیں ہو - بلکہ درحقیقت اگر پہلوی زبان پارسیوں کے رسم الخط میں لکھی جائے تو وہ پہلوی ہے، اور اگر عربی رسم الخط میں ہو تو فارسی ہے - گویا جس زبان کو فارسی کہتے ہیں وہ نہ دری ہے نہ پہلوی بلکہ ایک رسم الخط ہو جو فتوحات اسلامیہ کے بعد پیدا ہوا مگر ہمیں اس تحقیقات سے اختلاف ہو - کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ مسلمانوں سے پہلے ہندوستان کی جو فصیح ترین زبان خیال کی جاتی تھی وہ برج بھاشا تھی جس کا اثر ہندوستان کی دیگر زبانوں پر پڑا - اور ان زبانوں نے عربی و فارسی کا اثر لیکر جدید لشکری زبان قائم کی جس کو عرف عام میں اردو کہتے ہیں - اسی طرح فارسی فارس کی زبان تھی جسکا دارالحکومت شیراز ہے اور ایران بھر میں یہیں کی زبان اسی طرح ٹکسالی کہی جاتی جیسے ہندوستان میں لکھنؤ اور دہلی کی بول چال -

۵۱ قدیم فارسی یعنی - پہلوی اور جدید فارسی کے الفاظ کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ موجودہ فارسی زبان قدیم زبانوں کے تغیر پذیر ہونے سے کیونکر بنی : —

قدیم فارسی یا ژند	پہلوی	جدید فارسی	قدیم فارسی یا ژند	پہلوی	جدید فارسی
مَرَکھَا (موت)	مَرَک	مرگ	چھتھوارہ (چار)	.	چہار
تھریتاونا (بادشاہ کا نام)	فریتون	فریدوں	بندکا (غلام)	بندک	بندہ
آپ (پانی)	آپ	آب	سپادہ (فوج)	.	سپاہ
ہُوَ تُو (خود)	خُوث	خُود	دادی (میں دیتا ہوں)	.	دہم
رَوسادَ (دن)	روج	روز	مَدھو	.	مے
ہَہَا	آج	از	بُودھو	بود	بوئی
کَوفَہ (پہاڑ)	کوف	کوہ	پادھ (پادن)		پے
گاتھو (جگہ) ژند گاو	گاس	گاہ	کَدھَہ (کب)		کے

پاروتی

کیچڑ سے بھرے ہوئے تالابوں میں اکثر ایسے کنول دکھائی دیتے ہیں جن کے مقابلہ میں شاہی محلوں کے حوض میں کھلے ہوئے پھول پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ رنگ وہ روپ جو اُن میں ہے بھلا اِن میں کہاں ؟

پاروتی کیچڑ سے بھرے تالاب کے کنول کی کلی تھی۔ ایسی کلی جو جنگلی چڑیوں کی چھیڑ سے قبل از وقت کھل کر دنیا کا تماشہ دیکھنے لگی ہو۔ پندرہ سال کی عمر تھی وہ حسن ولطافت کی ایک دلکش دیوی تھی۔ تیر کی طرح سیدھی کھڑی ہو کر جب وہ مست شباب جھومتی ہوئی چلتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا حسن کا دیوتا اس کی راہ میں قدم قدم پر پھول برسا رہا ہے۔ اس کی "سویت۔ شیام۔ رتنار" آنکھوں میں وہ جادو تھا جو بڑے سے بڑے سنگدل کو بھی اپنا غلام بنائے بغیر نہیں رہتا۔

پھوس کی ایک جھونپڑی میں وہ رہتی تھی۔ جھونپڑی ایک باغ کے وسط میں تھی اور وہ باغ چاروں طرف باغوں سے گھرا ہوا تھا اُسی باغیچہ میں وہ اپنے ساس اور سسر کے ساتھ رہتی تھی۔ ماں باپ تو پہلے ہی مر چکے تھے جب اُس نے بارہویں سال میں قدم رکھا تو پاروتی کا شوہر بھی مر گیا اور وہ بیوہ ہوگئی۔ اس کے سسر نے دو باغ ٹھیکے پر لے رکھے تھے دو بکریاں اور کچھ مرغیاں پلی تھیں۔ جاڑے میں انڈے اور امرود اور برسات میں آم اور کٹھل بیچ کر اُن لوگوں کا کام چلتا تھا اسی میں وہ خوش تھے۔ اگر ایک وقت روکھا سوکھا کھا کر۔ پھٹے پرانے کپڑے پہن کر بسر اوقات کرنے کو سکھ سکیں۔ گھر کا سارا کام پاروتی کرتی تھی اس پر بھی اس کو روزانہ ساس اور سسر کی جھڑکیاں سنی پڑتی تھیں۔

پوس کا مہینہ اور صبح کا وقت تھا۔ پاروتی جھونپڑی میں جھاڑو دے رہی تھی اس کا سسر جوکھو کھاٹ پر بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا۔ جھاڑو دیتے ہوئے پاروتی نے کہا "بابا آج کھانے کو کچھ نہیں ہے"۔

"کچھ نہیں ہے ؟" ناریل منھ سے ہٹا کر۔ جوکھو نے بڑی حیرت سے پوچھا۔

"کچھ نہیں ہے۔ آٹا۔ دال نمک جو کچھ بھی تھا کل ختم ہو گیا"

"اتنی جلدی کیسے ختم ہو گیا رے۔ ابھی پچھلے اتوار کو اناج لے آیا تھا"

"تو کیا میں نے بیچ کر کھا لیا"۔

"اینڑی بینڑی" کیوں بولتی ہے رے ؟ سیدھے منھ بات نہیں کی جاتی رانڈ ابیکار ہی ٹرٹرا رہی ہے"۔

مجھے "اینڑی بیڑی" بولنا نہیں آتا میں نے تو ایک سیدھی سی بات کہی تھی"۔

"بس چپ رہ! نہیں تو مزاج درست کر دونگا"۔

پاروتی چپ ہوگئی۔ چلم زمین پر اُلٹ کر۔ ناریل ایک طرف رکھکر جوکھو نے تازے امرودوں کا ٹوکرا سر پر رکھا اور بازار کی طرف چل دیا اس کے جانے کے بعد پاروتی نے مرغیوں کو دربے سے نکالا اور انھیں چرانے کے لئے ہانکتی ہوئی باغوں کی طرف چلی۔

پاروتی ایک پیڑ کے نیچے کھڑی تھی کہ یکبارگی اس کے کانوں میں بانسری کی آواز آئی کیسی رسیلی تان تھی پاروتی کا دل دھڑکنے لگا کیوں؟ اس کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ ساری کو سنبھالتی ہوئی وہ بانسری بجانے والے کی تلاش میں ادھر ادھر پھرنے لگی۔ لیکن وہ کہیں دکھائی نہ دیا۔ بانسری خاموش ہوگئی پاروتی کو ایسا معلوم ہوا گویا ساری دنیا ایک گہری نیند میں سوگئی۔ دھڑکتے ہوے دل کو ہاتھوں سے دباکر وہ آگے بڑھی بانسری پھر بجنے لگی باغ میں پھر وہی سماں چھاگیا۔ مرغیوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ کھیاکر پاروتی نے مرغیوں کو لگی سے آگے بڑھانے کی کوشش کی مرغیاں اِدھر اُدھر بھاگنے لگیں۔ پاروتی حیران ہوگئی۔ اس کی آنکھیں پھر بانسری بجانے والے کو تلاش کرنے لگیں یکایک بانسری پھر رک گئی لیکن اس مرتبہ اس کی مراد بر آئی اُس نے کچھ دور ایک آم کی ڈال پر بانسری والے کو بیٹھے دیکھ لیا۔ وہ سانولے رنگ کا ایک خوشرو نوجوان تھا اس کے بغل میں دو کتابیں دبی ہوئی تھیں۔ پاروتی پر گویا اُس بڑی بڑی آنکھوں والے نوجوان نے کوئی جادو کر دیا وہ ایک ٹک دیکھتی کھڑی رہ گئی۔ نوجوان مسکرایا اور ڈال سے زمین پر کود پڑا۔ اس کی طرف سے نظر ہٹا کر پاروتی زمین کی طرف دیکھنے لگی آج تک کبھی کسی نوجوان کو دیکھکر اس کے دل میں ایسی ہلچل نہ مچی تھی اسوقت اس کو ایسا معلوم ہوا گویا اس دنیا میں نہیں ہے بلکہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ اس کے قریب ہوکر نوجوان نے پوچھا۔ کیا تم یہیں رہتی ہو؟ شرمائی ہوئی نظروں سے نوجوان کی طرف دیکھکر پاروتی نے جواب دیا۔ "ہاں! ادھر اس "بگیا" (باغ) میں جو کٹیا ہے اسی میں رہتی ہوں"

"یہ تمھاری مرغیاں ہیں"

"جی ہاں"

"تم ہی ان کو چرایا کرتی ہو"

"ہاں"

"تمھارے کون کون ہیں"

"یہ سب پوچھکر کیا کروگے بابو!"

کچھ نہیں - یونہی پوچھ رہا تھا" نوجوان کے چہرہ پر اُداسی چھاگئی - یہ دیکھکر پاروتی کے دل پر ایک چوٹ سی لگی - دنیا کی شرم و لحاظ سے وہ کچھ کہہ نہ سکی - لگی ادہر ادہر گھماتی ہوئی وہ مرغیوں کو آگے بڑھانے لگی -

ایک ٹھنڈی آہ بھر کر نوجوان نے حسرت بھری نظروں سے پاروتی کی طرف دیکھ کر کہا - "جاتی ہو! اچھا جاؤ ایک بات تو بتاتی جاؤ تمھارا کیا نام ہے؟"

پاروتی اب انکار نہ کرسکی اس معمولی سوال کا اُسے جواب دینا ہی پڑا - مڑکر نوجوان کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھتی ہوئی شرماکر پاروتی نے کہا - "میرا نام پاروتی ہے"

"پاروتی!"

"جی ہاں" وہ آگے بڑھ گئی -

جب تک پاروتی دکھائی دیتی رہی نوجوان اسے برابر دیکھتا رہا - پاروتی نے بھی کئی مرتبہ مڑمڑ کر اُس کی طرف دیکھا - جب پاروتی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی تو نوجوان ایک ٹھنڈی سانس کھینچ کر بانسری بجاتا ہوا آگے بڑھا - بانسری کی آواز میں اس وقت درد و غم بھرا تھا جس سے خود نوجوان کا دل تڑپ اُٹھا ادہر یہی آواز ہوا میں اُڑکر پاروتی کے کانوں میں پہونچی اور درد دل کو بڑھانے لگی - کچھ دیر ٹھہر کر نوجوان اس باغ میں پہونچا جہاں پاروتی نے اپنی جھونپڑی بنائی تھی - وہ امرودوں کا باغ تھا اسوقت پاروتی کی بوڑھی ساس رادھا کے سوا وہاں اور کوئی نہ تھا ——

"مائی پرنام"

"جیتے رہو بابو جی بھگوان آپ کو بنا ے راکھے" رادھا اپنی کمزور آنکھوں سے نوجوان کی طرف دھیان سے دیکھنے لگی "مائی! کچھ امرود کھلا سکتی ہو"

"بڑی خوشی سے"

"مگر بڑھیا امرود ہوں؟"

"میرے باغ کے امرود بڑے میٹھے ہیں - کھا کر آپ کا جی کھوس (خوش) ہوجائیگا - آیئے چارپائی پر بیٹھ جایئے میں ابھی توڑے دیتی ہوں" لگی اُٹھاکر رادھا امرود توڑنے لگی -

کھاٹ پر بیٹھکر نوجوان بانسری بجانے لگا - بانسری میں اس وقت بیراگ کا وہ نغمہ نکل رہا تھا جس کے بے چین دل کو چین ملتا ہے - رادھا نے پکار کر کچھ کہا - نوجوان نے بانسری بند کردی - "کیا ہے مائی"

"کتنے کا دوں بابو جی"

"جتنے کا جی چاہے دیدو مگر خوب عمدہ امرود ہوں"

"بہت اچھا بابو"

نوجوان پھر بانسری بجانے لگا تھوڑی دیر میں دس بارہ چھوٹے بڑے امرود رادھا نے لاکر نوجوان کے سامنے رکھدیے بانسری کو ایک طرف رکھکر نوجوان امرود کھانے لگا - "سچ مچ تمھارے باغ کے امرود بڑے میٹھے ہیں"۔

رادھا کے چہرہ پر فخر و خوشی کی جھلک دکھائی دی -

"تمھارے گھر میں کتنے پرانی ہیں"

"میں - میرا پتی اور ایک بیوہ بہو کے سوا اب بابو جی ہمارا اس دنیا میں کوئی نہیں - ہائے میرا جوان بیٹا مجھے اس بوڑھائی (ضعیفی) میں داغ دے گیا" رادھا کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے -

"تم یہاں اکیلی ہو"

"میرا پتی سودا بیچنے گیا ہے اور میری بدنصیب ودھوا بہو مرغی چرانے گئی ہے میں یہاں باغ کی رکھوالی کر رہی ہوں"

"اس سال فصل کیسی ہے"

"بہت اچھی ہے بابو جی - دیکھئے نہ سارے پیڑ پھلوں سے لدے پڑے ہیں - ابھی تو بہت اچھا رنگ ہے، آگے چل کر اتر نہ جائے تو جانوں"

"یہ باغ بڑی اچھی جگہ پر ہے"

"ہاں بابو جی! اس "بگیا" کو لئے مجھے آٹھ سال ہو گئے اسے چھوڑ کر میرا جی کہیں جانے کو نہیں چاہتا"

"میں آج پہلی مرتبہ آیا ہوں لیکن میرا بھی یہی حال ہے"۔

"آپ کا گھر کہاں ہے بابو جی!"

"میں لکھنؤ کا رہنے والا ہوں، یہاں ایک ضروری کام سے آیا ہوں"

"یہاں کب تک ٹھہرنا ہوگا بھیا"

"دو تین مہینے تو یہاں ضرور رہونگا"

"آپ کیا کام کرتے ہیں"

"ابھی تو پڑھتا ہوں"

"آپ کے ماں باپ تو ہیں نہ بھیا"

"صرف بوڑھے باپ ہیں اور کوئی نہیں - جب میں سات برس کا تھا تو میری ماتا جی سرگباش ہوئیں -

پتاجی زمینداری کا کام کرتے ہیں"

وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ جوکھو آگیا وہ بھی نوجوان سے مل کر بہت خوش ہوا۔ جوکھو کی طرف دیکھتے ہوئے نوجوان نے کہا۔ "کیوں بابا میرے لئے یہاں کوئی کٹیا بنوا سکتے ہو مجھے یہ جگہ بہت پسند ہے یہاں رہنے کو جی چاہتا ہے"

اچھی بات ہے بھیا۔ میں اس باغ میں آپ کو کٹیا بنوا دونگا آپ یہاں خوشی سے رہیں"

"کٹیا بنوانے میں کتنا خرچ لگے گا بابا!"

"پندرہ روپئے سے کیا کم لگے گا"

"نوجوان نے اسی وقت جوکھو کو پندرہ روپئے دیدیئے۔ جوکھو نے پوچھا۔ "آپ کا کیا نام ہے بابوجی"

"میرا نام رام سیوک ہے"

ایک گھنٹہ کے بعد مرغیوں کو چرا کر جب پاروتی واپس ہوئی تو اپنے سسر کے ساتھ رام سیوک کو باتیں کرتے دیکھکر اس کو بڑا تعجب ہوا۔ خوشی کے مارے اس کا دل ناچ اٹھا اس کو ایسا معلوم ہوا گویا اس کی کھوئی ہوئی چیز مل گئی۔ گھونگھٹ کی اوٹ سے ایک مرتبہ رام سیوک کو دیکھکر وہ جھونپڑی کے اندر چلی گئی۔ خود کو تھوڑی دیر تک سنبھالے ہوئے وہ چپ چاپ کھڑی رہی پھر بار بار کر پھوس کی ٹٹی کے ایک بڑے سوراخ میں آنکھیں لگا کر وہ باہر کی طرف جھانکنے لگی۔ اب رام سیوک جانے کے لئے تیار تھا اس نے اپنی جیب سے ایک روپیہ نکال کر جوکھو کو دیا اور کہا "امرود کے دام لے لو"

جوکھو نے کہا۔ پیسے تو اس وقت میرے پاس نہیں ہیں۔ دلھن! اری او دلھن! تیرے پاس ایک روپیہ کا پیسہ ہے"۔

"سوراخ سے الگ ہٹ کر اور جلدی سے باہر نکل کر پاروتی نے کہا۔ نہیں بابا! پیسے تو نہیں ہیں"

رام سیوک نے کہا۔ کوئی پرواہ نہیں پھر لے لونگا۔ اچھا اب چلتا ہوں کل پھر اسی وقت آؤنگا۔ بندگی!"

آگے بڑھ کر رک کر ایک بار پاروتی کی طرف دیکھکر رام سیوک باغ سے باہر نکل گیا۔ ایک طرف زمین پر بیٹھکر من مارے ہوئے پاروتی جھوٹے برتن صاف کرنے میں لگ گئی۔ دور سے پھر بانسری بجنے کی آواز سنائی دی پاروتی کا دل اس کے قبضہ سے نکل جانے کے لئے تڑپ رہا تھا لیکن وہ تو خود سماجی پابندیوں میں گرفتار تھی دل کو کیسے آزاد کر سکتی تھی۔

چار دن میں کٹیا تیار ہوگئی۔ پانچویں دن سویرے رام سیوک چمڑے کا ٹرانکس اور ایک بستر لے کر آگیا

جوکھو نے اس کے آرام کی تمام چیزیں مہیا کر دیں۔

اس پر فضا مقام پر رہتے ہوئے رام سیوک کو دو مہینے ہو گئے - وہ وہاں کی سادی زندگی کا بخوبی عادی ہو گیا - باغ سے کچھ دور پر گنگا جی بہتی تھیں صبح وشام رام سیوک وہیں سیر کرنے چلا جاتا - دوپہر کو کسی چھتنار درخت کے نیچے لیٹ کر یا تو کوئی کتاب پڑھتا یا محو خیال رہتا - شام کے وقت پاروتی اس کے لئے کھانا پکا دیتی دوپہر کو وہ صرف دودھ یا پھل پر گزارہ کرتا - ایک دن شام کے وقت جب وہ سیر سے واپس ہوا تو اُس نے جوکھو کی عورت بھگی کو اپنی کھٹیا پر بیٹھے دیکھا "

" رام سیوک نے پوچھا - " یہاں کیوں بیٹھی ہو مائی! "

" تم یہاں نہیں تھے اس لئے یہاں آ گئی - یہاں کا کچھ ٹھیک نہیں ہے بھیا - چور بدمعاش ادھر آتے رہتے ہیں " لالٹین کی روشنی میں رام سیوک نے دیکھا کہ بھگی کی ساری کئی جگہ سے پھٹی ہوئی ہے -

" تمھارے پاس کوئی دھوتی نہیں ہے کیا؟

" نہیں بیٹا! دو دھوتیاں تھیں دونوں پھٹ گئیں؟ "

" اچھا میں کل شہر جا کر تمھارے لئے دھوتیاں لاؤں گا "

" جیتے رہو بیٹا! تم بڑے آدمی ہو - ہم غریب آدمیوں کو تم ہی ایسے امیروں کا سہارا رہتا ہے "

" میں بڑا آدمی نہیں ہوں مائی! یہ تمھاری بھول ہے دنیا میں ہم سب برابر ہیں - بڑا - چھوٹا - نیچ - اونچ - امیر و غریب یہ سب دنیا کا تماشہ ہے اسی کی وجہ سے آج ہماری یہ خراب حالت ہو رہی ہے "

" ٹھیک کہتی ہو بھیا (مگر لیکن) جیسا تمھارا خیال ہو ویسا سب کا تو نہیں ہے " تمھارا کھانا تیار ہو گیا ہے یہاں لے آؤں -

" کیوں تکلیف کرو گی چلو میں وہیں کھالوں گا "

" اس میں تکلیف کی کونسی بات ہے بیٹا - ہمارے بھاگ دھن ہیں جو تم ہمارے ہاتھ کا بنایا کھانا کھالیتے ہو کوئی ہم لوگوں کا چھوا ہوا پانی بھی نہیں پیتا "

" ہاں مائی اسی چھوت چھات نے تو ہمارا ستیاناس کر دیا ہے یہی اندھیر دنیا میں چاروں طرف دیکھ رہا ہوں "

بھگی اُٹھ کر اپنی جھونپڑی سے رام سیوک کے لئے پھول کی ایک چمکتی ہوئی تھالی میں کھانا لے آئی اس وقت وہ بہت خوش تھی گویا وہ پوجا کا سامان لے کر کسی دیوتا کے سامنے آئی ہے - تھالی کو رام سیوک کے سامنے رکھ کر بھگی کھاٹ کے قریب زمین پر بیٹھ گئی - رام سیوک کھانا کھانے لگا -

" تمھارے یہاں بہت اچھا کھانا پکتا ہے مائی! "

" یہ تمھارا خیال ہے بھیا! تمھارے گھر سے بڑھ کر ہمارے یہاں کھانا نہیں بن سکتا "

"نہیں مائی! جھوٹی تعریف نہیں کرتا - بالکل سچ کہہ رہا ہوں"

بھگی کا دل فخر و انبساط سے پھول گیا -

"میں نے بڑے بڑے گھروں میں کھانا کھایا ہے لیکن جو لطف جو مزہ تمھارے کھانے میں مجھے ملا ہے وہ کہیں نصیب نہیں ہوا - مائی یہ تمھاری محبت کی وجہ سے ہے"

"خوشی کی ترنگ میں ہلوریں لیتی ہوئی بھگی چپ چاپ بیٹھی رہی -

"کھانا کھاکر رام سیوک منھ ہاتھ دھونے لگا اور بھگی جھوٹی تھالی لیکر چلی گئی"

دوسرے دن رام سیوک نے اپنا وعدہ پورا کر دیا شہر سے وہ کپڑے خرید لایا - دو دھوتیاں بھگی کے لئے دو پاروتی کے لئے اور دو جوکھو کے لئے تھیں - بھگی اور پاروتی کے شلوکوں کے واسطے بھی کپڑے تھے - جوکھو کے لئے مرزئی اور کرتے کا کپڑا تھا - ایک ساتھ اتنے کپڑے ان غریبوں کو کبھی نصیب نہ ہوئے تھے - بھگی نے تو اپنی دھوتیاں رنگ لیں لیکن پاروتی کا تو سہاگ اجڑ چکا تھا وہ تو بیوہ تھی رنگین دھوتی نہیں پہن سکتی تھی -

سہ پہر کا وقت تھا اپنی کٹی سے نکل کر رام سیوک جوکھو کے باغ میں پہونچا اس وقت پاروتی کے سوا وہاں اور کوئی نہ تھا - جھونپڑی کے سامنے ایک کھاٹ پر بیٹھی پاروتی چاول بن رہی تھی گھونگھٹ کی اوٹ سے ایک بار رام سیوک کی طرف دیکھکر اس نے پھر اپنا سر جھکا لیا -

"پاروتی!"

"جی"

"سب لوگ کہاں چلے گئے"

"اماں ایک پڑوسی کے یہاں گئی ہیں اور بابا سودا بیچنے گئے"

"تم کہیں نہیں گئیں"

"جی نہیں - یہاں "بگیا" تاکنے کے لئے کسی کا رہنا ضروری تھا - اور یوں بھی کسی کے گھر جانا مجھے اچھا نہیں لگتا"

"یہ کیوں؟"

"جس کے یہاں جاؤ وہی اپنا دکھڑا سنانے لگتا ہے مجھے یہ اچھا نہیں لگتا"

"تمھارے ساس سسر تمھارے ساتھ کیسا برتاؤ کرتے ہیں"

"اب تو انھیں لوگوں کے پالے پڑی ہوں جیسا بھی برتاؤ کریں گے مجھے سہنا پڑے گا"

"ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رام سیوک نے کہا - اس کا یہ مطلب ہے کہ تم یہاں خوش نہیں ہو"

پاروتی کے اداس چہرہ کی طرف رحم بھری نظروں سے دیکھکر رام سیوک کا دل بھر آیا وہ ایک آہ کھینچ کر ادہر اُدہر ٹہلنے لگا ———

"بابوجی"

"کیا ہے پاروتی!" کچھ رکتی ہوئی آواز سے رام سیوک نے کہا۔

"آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں

"بڑی خوشی سے پوچھ سکتی ہو"

"آپ ہم لوگوں کے لئے یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہیں"

"اس کا میں کیا جواب دوں پاروتی! اچھا یہ بتاؤ اگر میں تمھاری جگہہ پہ ہوتا اور تم میری جگہہ پر تو کیا تم میرے ساتھ یہی نہ کرتیں"

"کچھ سوچکر پاروتی نے کہا ——— "ہاں کیوں نہ کرتی۔ ضرور کرتی"

"بس یہی جواب ہے"

"ایک بات اور ہے بابوجی! آپ کون ہیں اور کیا کام کرتے ہیں۔ یہ تو میں سُن چکی ہوں کہ آپ لکھنؤ کے کسی زمیندار کے لڑکے ہیں لیکن آپ نے اصلی حال چھپایا ہے"

"میں کون ہوں؟" رام سیوک بڑی الجھن میں پڑ گیا۔ وہ کون ہے اس کے لئے یہ بتانا مشکل ہو گیا۔ کچھ دیر چپ رہ کر اُس نے کہا — تم یہ جان کر کیا کروگی پاروتی!"

"کچھ نہیں۔ یوں ہی پوچھ رہی تھی"

"اچھا کچھ دن اور صبر کرو تمھیں سب معلوم ہو جائیگا"

"پاروتی کی پہیلی حل نہ ہو سکی وہ ہار کر پھر چاول بننے لگی۔ رام سیوک نے بھی وہاں زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور گنگناتا ہوا اپنی کٹی کی طرف چلا گیا۔

رام سیوک کی فیاضی کی خبر آہستہ آہستہ آس پاس کے گانوؤں میں پھیلنے لگی۔ جو کھو سے سب جلنے لگے۔ آخر جوکھو نے کون سے اچھے کام کئے ہیں جو بھگوان نے اس کے گھر پہ ایسا نیک اور فیاض انسان بھیج دیا۔ وہ اپنے باپ کا نہیں ہوا بھائی کا نہیں ہوا لڑکپن ہی میں وہ اپنے باپ سے الگ ہو گیا آگے چل کر بھائی سے مقدمہ بازی کی پھر بھی جوکھو سے بھگوان خوش ہے۔ رام سیوک کا درشن کرنے کے لئے لوگ اس کی کٹی پر پہونچنے لگے اور رام سیوک حتی المقدور اُن کی مدد کرنے لگا۔ رام سیوک مدد کرنے سے تو نہ گھبراتا تھا لیکن وہ تو تنہائی چاہتا تھا اسی کے لئے تو اس نے

اپنا گھر بار چھوڑا تھا لیکن اب تو وہ آدمیوں سے گھبرا رہنے لگا اُس نے سوچا کہ اب وہ یہاں نہ رہے گا لیکن یہاں سے جانے کو اس کا جی نہ چاہتا تھا۔ جس خیال کو وہ اتنے دنوں تک اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھا اب وہ اس سے بہت پریشان رہنے لگا۔

شام کا وقت تھا کھانا کھا کر رام سیوک اپنی کٹی میں آرام کر رہا تھا۔ پان کے دو بیڑے ہاتھ میں لئے پاروتی دروازہ پر آکر کھڑی ہوگئی۔ پان لے لو بابو جی!"

"کون پاروتی؟ اچھا!" کہتا ہوا رام سیوک اُٹھا اور اُس نے پاروتی کے ہاتھ سے پان کے بیڑے لے لئے اس کی انگلیاں پاروتی کی انگلیوں سے مس ہوگئیں دونوں کا جسم کانپ اُٹھا۔

پاروتی نے محبت آمیز نظروں سے رام سیوک کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا آپ سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں بابو جی"

کہو! پاروتی بڑی خوشی سے کہو۔ میں تو تمھاری باتیں سننے کے لئے بے چین ......" رام سیوک رک گیا پاروتی کچھ شرما سی گئی۔

رام سیوک نے کہا۔ ہاں تو پاروتی تم کیا کہنا چاہتی ہو"

"رات کے وقت بانسری نہ بجایا کیجئے"

کیوں؟ رام سیوک نے مسکرا کر پوچھا۔

"کچھ سوچ کر پاروتی نے کہا۔ یہاں جنگل ہے چاروں طرف سانپ رہتے ہیں ان کے نکلنے کا ڈر رہتا ہے"

"تم سانپ سے ڈرتی ہو کیا؟"

"جی نہیں۔ کئی بار تو میں نے خود سانپوں کو مارا ہے"

"تو پھر؟ کیا سچ مچ تم اسی لئے مجھے منع کر رہی ہو"

پاروتی کچھ جواب نہ دے سکی۔ ان جذبات کو جنھیں وہ اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھی اس وقت ایک دم کھولنے کی ہمت پاروتی میں نہ تھی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ "جب تم رات کو بانسری بجاتے ہو تو دل میں ہوک سی اُٹھنے لگتی ہے مجھے ساری رات نیند نہیں آتی" لیکن وہ ایسا نہ کہہ سکی وہ اپنا دل مسوس کر رہ گئی مگر رام سیوک سے اس کی یہ حالت پوشیدہ نہ رہ سکی رام سیوک نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ——— "اچھا پاروتی! اب رات کو بانسری نہ بجایا کروں گا" پاروتی اُٹھتی ہوئی آہ کو دبائے ہوئے رام سیوک سے رخصت ہوگئی۔ رام سیوک اپنے بستر پر گر پڑا۔ وہ پاروتی کے دل کا حال اس کی زبان سے سننا چاہتا تھا یہ نہ ہو سکا۔ پھر بھی پاروتی کے حال سے وہ ناواقف نہ تھا۔ اُس نے سوچا اب یہاں زیادہ ٹھہرنا مناسب نہیں ہے اگر زیادہ دن رہوں گا تو بدنام

و جاؤں گا - میں تو گھر سے اسی بات پر ناخوش ہو کر نکلا تھا کہ شادی نہ کرونگا مگر قدرت کا کون مقابلہ کر سکتا ہے جنگل
ں آکر مصیبت میں پھنس گیا ---- کیا پاروتی میری ہوسکتی ہے؟ مگر وہ تو بیوہ ہے اس کے ساس سسر بھلا اسکی
سری شادی کیوں کرنے لگے؟ مگر نہیں ایک مرتبہ پاروتی سے پوچھ لوں اگر وہ راضی ہو جائے تو میں دنیا کی بدنامی
کچھ خیال نہ کروں گا - پتاجی کو میں مناؤں گا تو بس ٹھیک ہے آج کی رات یہاں اور رہوں پھر یا تو پاروتی
ری ہو جائے گی یا میں یہاں سے پھر کہیں بھاگ جاؤں گا ایسی جگہ جہاں میرا کوئی نام و نشان بھی نہ پائے گا۔"

دوسرا دن بھی گذر گیا لیکن رام سیوک کو اس دن پاروتی سے ملنے کا موقع ہی نہ ملا کیونکہ پاس کے گاؤں سے
ت سے لوگ اس سے ملنے آگئے اور تمام دن رام سیوک کو گھیرے رہے - شام کے وقت ایک بوڑھے کسان نے
م سیوک کو علیحدہ بلاکر چپکے سے کہا - "بھیا! گاؤں میں آپ کی بڑی بدنامی ہو رہی ہے"

رام سیوک کا کلیجہ دھک سے ہو گیا ---

سب لوگ کہتے ہیں کہ آپ اور پاروتی ------

رام سیوک نے اپنا منھ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا جس بات سے وہ ڈرتا تھا وہ اس کے سامنے آگئی - شام
سب لوگ چلے گئے اور اس کی کٹی سنسان ہو گئی لیکن رام سیوک کے دل میں جذبات کے طوفان اٹھ رہے تھے
ں میں آج ہی رات کو یہاں سے بھاگ جاؤں گا - میں پاروتی کی بدنامی نہیں چاہتا"

شام کو اس نے کھانا بھی نہ کھایا بلکہ سر میں درد ہونے کا بہانہ کرکے وہ اپنی کھاٹ پر پڑا رہا - رات کے بارہ بجے تھے
م سیوک اپنے بستر پر بڑی بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا اس کی آنکھوں میں نیند نہ تھی عجیب طرح کے خیالات
س کے دل میں آرہے تھے، لیکن وہ سوچتا "بس اس وقت یہاں سے چل دینا چاہئے" اور کبھی کہتا نہیں ایک مرتبہ
اروتی سے مل کر اس سے بھی تو پوچھ لوں" وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اس کی جھونپڑی کے دروازہ پر آکر کوئی کھڑا
ہو گیا - رام سیوک نے پوچھا ---- "کون؟"

"میں ہوں"

"کون پاروتی! اس کے تعجب کا کوئی ٹھکانا نہ تھا -

"جی ہاں"

رام سیوک نے اٹھکر لالٹین جلائی - دروازہ پر پاروتی گھبرائی ہوئی کھڑی تھی - اس کے لمبے لمبے بال
نوں پر بکھرے ہوئے تھے - رام سیوک نے کہا - "اندر آجاؤ پاروتی! کیا بات ہے"

بغیر کسی جھجھک کے پاروتی اندر آگئی -

"بیٹھ جاؤ"

"پاروتی ایک طرف زمین پر بیٹھ گئی اور کہا ــــ "بابوجی! آج تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا۔ کیا خفا ہو گئے؟"

"نہیں پاروتی! میں بھلا خفا ہو سکتا ہوں اصل بات یہ ہے کہ میری طبیعت کچھ خراب تھی"

"کیا یہ بات سچ ہے؟"

رام سیوک کوئی جواب نہ دے سکا۔ تھوڑی دیر انتظار کر کے پاروتی نے کہا۔ "بابوجی! تم کو اصلی بات بتانی پڑے گی میں تمھارے پاؤں پڑتی ہوں بتا دو" یہ کہتی ہوئی پاروتی نے رام سیوک کے قدموں پر سر جھکا دیا۔ ہاں ہاں یہ کیا کرتی ہو؟" کہتا ہوا رام سیوک کھڑا ہو گیا۔ دبی ہوئی چنگاری بھڑک اُٹھی۔ رام سیوک اب اپنے کو نہ سنبھال سکا۔ اس نے پاروتی کو ہرانا چاہا تھا لیکن خود ہار گیا وہ پاروتی کی زبان سے اس کا حال دل سننا چاہتا تھا لیکن آج اس کو خود اپنا درد دل سنانا پڑا اس نے کچھ دیر ٹھہر کر کہنا شروع کیا ــ "پاروتی آس پاس کے گاؤں میں ہماری بدنامی ہو رہی ہے۔ اور اس کو بھی جانے دو یہ بتاؤ اگر اس وقت یہاں تم کو کوئی دیکھ لے تو کیا ہو"

"چاہے جو ہو مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ بہت ہو گا گھر سے نکال دی جاؤنگی۔ محنت مزدوری کر کے میں اپنا پیٹ پال سکتی ہوں"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن دنیا میں ہماری تمھاری بہت بدنامی ہو گی"

"ہوا کرے نیکنامی بدنامی کوئی چیز نہیں ہے دوسروں کو بدنام کرنے والوں کو میں خوب سمجھتی ہوں اتنے دنوں سے دنیا کا رنگ دیکھ رہی ہوں جو دوسروں کو بدنام کرتے ہیں وہ لچے ہوتے ہیں"

"ٹھیک کہتی ہو پاروتی! دنیا کا رنگ بالکل یہی ہے۔ تمھاری باتیں سنکر مجھے بڑی خوشی ہوئی تم سچ مچ بہادر عورت ہو"

"فخر سے پاروتی کا چہرہ کھل گیا"

"رام سیوک نے پھر کہا" پاروتی! میں تم سے ایک بات بہت دنوں سے کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہ سکا"

"وہ کون بات بابوجی!"

"تم میری ہو جاؤ"

"پاروتی نے شرما کر اپنا سر نیچا کر لیا"

"پاروتی! بولو کچھ جواب دو"

"میں تو آج سے نہیں بلکہ اسی دن سے جب میں نے تم کو پہلے پہل دیکھا تھا تمھاری ہو چکی ــــ لیکن خیال رہے کہ میں بیوہ ہوں"

"کوئی پرواہ نہیں - میں کوئی پاپ نہیں کر رہا ہوں - میں تمھارے ساتھ اپنا بیاہ کرونگا"

"میں نے ایک غریب نیچ ذات کھٹک کے گھر میں جنم لیا ہے"

"کچھ حرج نہیں"

"تمھارے پتاجی کیا کہیں گے"

"کچھ بھی نہیں"

"برادری تمھارا ساتھ چھوڑ دیگی"

"تم کو پاکر مجھے برادری کی کوئی فکر نہیں - برادری تو صرف دولت کی بھوکی ہے ایک بھوج دے کر سب کو ٹھیک کر لوں گا"

پاروتی کی آنکھوں میں جوش مسرت سے آنسو بھر آئے ٹھیک اسی وقت دروازہ پر جوکھو اور بھگی نے قدم رکھا - جوکھو نے دانت پیس کر پاروتی سے کہا - "رانڈ! یہ کیا - تو نے کہیں ہمیں منھ دکھلانے کے لائق نہ رکھا - اور بابوجی تم! تم تو بڑے بگلا بھگت نکلے"

پاروتی نے کہا - بابا! بابوجی کو کچھ نہ کہو میں اپنی خوشی سے ان کے پاس آئی ہوں"

بھگی بولی - پاپن چپ نہیں رہتی - بات کرتے شرم نہیں آتی"

"میں نے کوئی پاپ نہیں کیا"

"اچھا پاپن تو اب یہاں سے اپنا منھ کالا کر ہم لوگوں کو اب تجھ سے کچھ مطلب نہیں" یہ کہکر دونوں وہاں سے چل دیئے - صبح ہوئی تو باغ میں رام سیوک اور پاروتی کا پتہ نہ تھا کٹیا خالی پڑی تھی بہت دنوں تک گانوں والے اس کا چرچا کرتے رہے لیکن پھر رام سیوک اور پاروتی کو بالکل بھول گئے - ادھر پاروتی رام سیوک کے ساتھ لکھنؤ پہنچی جہاں ان دونوں کا بیاہ ہوگیا برادری نے اس شادی کی ضرور مخالفت کی مگر ایک بھوج دینے ہی سے سب راضی ہو گئے - (ماخوذ از ریس)

اعظم کریوی

خواب وخیال عار	عرب و اسکا مستقبل عہ	ایک ارزاں سودا	فلاسفۂ قدیم عہ	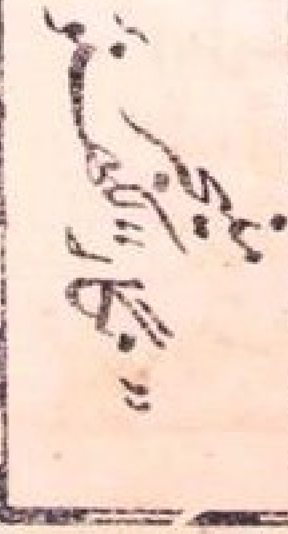
زہر عشق عہ	شاعر کا انجام ۱۰ر	ان سب کتابوں کی مجموعی قیمت علاوہ محصول عنـہ ہے - لیکن یہ سب کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے میں آپ کو علاوہ محصول عـہ میں مل سکتی ہیں ہر آرڈر کے ساتھ چوتھائی قیمت آنا ضروری ہے	جذبات بھاشا ۱۲ر	
شوپنہار عہ	بحر تبسم عہ		نقاب اٹھ جانے کے بعد عہ	
فلسفہ مذہب عہ	موج تبسم عہ		لالہ رخ عہ	
تذکرہ خندۂ گل عار	فراست الید عہ		فراست التحریر مکمل عہ	
انتخاب گلابی اردو ۸ر	مذاکرات نیاز ۱۲ر		سول فانے ۱۲ر	

باب المراسلۃ والمناظرۃ

عید نوروز

(جناب خیر بھوروی صاحب دفتر العلیم - گورکھپور)

مصدر لطف و کرم مولینا نیاز ! سلام مسنون

دنیائے اسلام آپ کی منت پذیر اور شکر گزار ہوگی اگر آپ اپنے فرصت کے خاموش لمحوں میں میرے معروضات پر غور فرما کر اپنی "تحقیقی" "غیر فانی" اور زریں رائے کا اظہار فرمائیں گے۔

۱۔ "عید نوروز" کی تاریخی وقعت اور حیثیت کیا ہے ؟ آیا اس "جشن پارسی" کو "اسلامی عید" اور مذہب کا ایک ضروری جزو قرار دیکر مستحب سمجھنا اور دنیائے اسلام کو شمولیت کی دعوت عام دینا طفلانہ ضد اور ہٹ سے زیادہ وقیع ہے ؟

۲۔ "جونپور" کے ایک بزرگ جن کا نام نامی اسم گرامی یوں سپرد قلم ہو کر زیب قرطاس ہوتا ہے

"سالک مسلک جعفریہ کاشف حجب ظلمانیہ جہلیہ محقق علل نورانیہ قدسیہ موئید اخبار و احادیث نبویہ فاضل جلیل جناب مولانا سید محمد ہادی صاحب حرسہ اللہ عن شر البریہ"

اپنے رسالہ "شمسیہ" مطبوعہ "کاظمی پریس جونپور" میں "عید نوروز" (جشن پارسی) کو "اسلامی عید" ہونا قرار دیتے ہیں لیکن ریسرچ (تحقیق) سے الگ محض خوش عقیدگی کی بنا پر یا زیادہ سے زیادہ اپنی جماعت کو خوش کرنے کے لئے۔

میں اسے محسوس کرتا ہوں اور بہت اچھی طرح جانتا ہوں کہ میرے اس مضمون کے شائع ہونیکے بعد شیعی ارباب صحافت "نوروز" کے مضمون پر بہت کھل کھیلیں گے اور ہندوستان کے شیعی افق سے تحریرات "عید نوروز" کی گھٹائیں زور و شور سے اٹھیں گی کوئی گھٹا زیادہ اور کئی بار برسے گی اور کسی سے صرف ترشح رشحات ہی ہو کر رہ جائیگا۔

بہر حال حقیقت اور واقعیت کا برافگندہ نقاب ہونا مقصود ہے نہ کہ کسی کی دل آزاری

یا مناظرہ ومجادلہ شیعی ارباب صحافت محققین سے بحث نہیں، بلکہ

"کاشف حجب ظلمانیہ جبلیہ تحقیق علل نورانیہ قدسیہ جناب مولانا مولوی

سید محمد ہادی" صاحب "جونپوری"

اگر محققانہ جواب دے سکتے ہیں تو بذریعہ "نگار" صرف امور ذیل کا جواب دیں اور جو ثبوت اور دلیل پیش کریں وہ صرف جہلا ہی کے لئے دل خوش کن نہ ہو بلکہ اہل علم کی جماعت کے لئے بھی قابل قبول ہو "تلک عشرۃ کاملۃ"

۱- اسلام کے اعمال واحکام میں سال وماہ قمری کا لحاظ رکھا گیا ہے یا شمسی کا؟ اور اگر دونوں ملحوظ ہیں تو کس کس علم وحکم میں۔؟

۲- اسلام میں سال کے اندر کتنی عیدیں رسول صلعم کے عمل یا قول سے ثابت ہیں؟

۳- آیا عید الفطر اور عید الضحےٰ کی طرح "عید نوروز" بھی آنحضرت صلعم کے فعل یا قول سے کہیں ثابت ہے؟ اور اس کے بغیر اس کو "اسلامی عید" قرار دینا اور کہنا صحیح ہے؟

۴- اگر رسول صلعم کے قول یا فعل سے ثابت نہیں تو سیدنا علیؓ "باب مدینۃ العلم" نے بھی یہ عید منائی؟ یا اس کا حکم کسی کو دیا؟ خواہ اس کا استحباب ظاہر فرمایا؟ "ثابت" بدرا مام بوحنیفہ کا ہدیہ "نوروز" جو قبول فرمایا تو اس وقت کم از کم اُس دن کی کوئی اچھائی بیان فرمائی؟

۵- یہ نہیں تو سیدنا امام حسنؓ، امام حسینؓ، امام زین العابدینؓ، امام باقرؓ، (رضی اللہ علیہم اجمعین) میں سے کسی نے یہ عید منائی؟ یا اس کو مستحب وپسندیدہ قولاً یا عملاً قرار دیا؟

۶- یہ سب نہیں تو سیدنا امام جعفر صادق رضہ کا عمل کہیں سے ثابت ہے؟ یا "معلی بن خنیس" کے ذریعے صرف دوسروں ہی کو ہدایت فرما دی؟

۷- یہ بھی نہیں تو "معلی بن خنیس" کے سوا کسی اور واسطے سے بھی حضرت امامؓ کا یہ قول یا اس کا ہم معنی کوئی قول ثابت ہے؟ یا صرف "معلی بن خنیس" ہی کے حصے میں ایسی اچھوتی روایت ازل کے روز لکھی گئی تھی؟

۸- حضرت امام صادق آیا اپنے جد خیر الجدود صلعم کے متبع اور پیرو تھے، یا خود صاحب شریعت یا متمم یا مصلح شریعت نبی تھے اور متقدم نبیؑ کی شریعت سے زائد ایک جدید شرعی واسلامی عیدوہ قائم کر سکتے تھے؟

۹- تمام عالم کے مسلمان سُنی وشیعہ تو بظن غالب یہی یقین رکھتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادقؓ بحق

ناطق تھے - خدا اور رسول کے احکام و ہدایات سے خارج نہ ان کا قول ہوتا تھا نہ فعل - لیکن "معلی ابن خنیس" شریعت مصطفوی سے خارج اور اعیاد اسلامی سے زائد ایک عید کی قرارداد آنجناب کی ذات مقدس کی طرف منسوب کرتے ہیں - اس صورت میں راوی یا مصنف کو غلط بیان تسلیم کر لینا مقتضائے حسن ظن و مقتضائے عقل ہے - یا حضرت امامؑ کے دامن عصمت پر سنت رسول کی خلاف ورزی اور بدعت کا دھبہ قرین قیاس ہے؟

۱۰ - "نوروز" کو عام "اسلامی عید" کہنا جب ہی صحیح ہو گا کہ حضور شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ثابت ہو اور استحباب بھی ایسی صورت میں مانا جائے گا۔ اصحاب یا عترت نبی کے فعل سے ثابت ہو اور جب تک ان دونوں میں سے کسی کا باضابطہ ثبوت سامنے نہ لایا جائے "اس جشن پارسی" کو "اسلامی عید" یا مستحب کہنا طفلانہ ضد اور ہٹ ہو گی۔

(نگار) ہر چند مجھ پر مکتوب گرامی کا جواب عائد نہیں ہوتا کیونکہ آپ نے براہ راست سید محمد ہادی صاحب جونپوری کو مخاطب کر کے اُنھیں سے جواب چاہا ہے، لیکن جس حد تک صرف "جشن نوروز" کا تاریخی یا معاشری تعلق ہے مجھے اظہار رائے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔

"عید نوروز" نہایت قدیم چیز ہے اور شاید ہی کوئی قوم ایسی ہو جس نے سال میں ایک دن اس تقریب کے لئے مخصوص نہ کیا ہو اور اسی دن سے سال کی ابتدا نہ کی ہو - پھر چونکہ اس جشن کا تعلق آغاز موسم بہار سے ہے اور مختلف ممالک میں بہار کے مختلف زمانے ہوتے ہیں اس لئے "عید نوروز" کی تاریخیں بھی مختلف نظر آتی ہیں - قدیم مصریوں اور ایرانیوں میں عید نوروز کا زمانہ وہ ہوتا تھا جب آفتاب برج حمل میں جاتا تھا اور خط اعتدال پر ہوتا تھا - یعنی ۲۱ ستمبر - یونانیوں میں پانچ سو سال قبل مسیح تک جو وقت اس جشن کا مقرر تھا اُسے ۲۱ دسمبر سمجھنا چاہیے اس کے بعد انھوں نے ۲۱ جون کا وقت مقرر کیا - قدیم رومیوں میں بھی پہلے ۲۱ دسمبر ہی مقرر تھی لیکن پھر یکم جنوری کر دی گئی - یہودیوں میں اس کا زمانہ تشرین کے مہینے پر ہوا کرتا تھا - یعنی مابین ستمبر و اکتوبر - عہد وسطیٰ کے عیسائیوں میں جشن نوروز ۲۵ مارچ کو ہوا کرتا تھا لیکن ۱۶۰۰ء تک یورپ کے اکثر ممالک نے یکم جنوری کو متفقہ طور پر تسلیم کر لیا ہندوؤں کے یہاں بسنت و ہولی کا زمانہ سمجھیے - عربوں میں قبل ظہور اسلام جو صورت بھی رہی ہو لیکن ظہور اسلام کے بعد یقیناً کوئی مخصوص تاریخ عید نوروز کی ہو ہی نہ سکتی تھی کیونکہ قمری مہینوں کے سال میں اس کا التزام ناممکن ہے اور اسلام نے موسم کے لحاظ سے "اعیاد و رسوم" کے تعین پر کوئی توجہ نہیں کی اور نہ اس وقت کی سیاسیات کا اقتضا یہ ہو سکتا تھا - اس لئے مذہبی نقطۂ نظر سے "عید نوروز" کی اہمیت کو ثابت کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے یہ دعویٰ کرنا کہ ماہ محرم قمری حساب سے بھی ہمیشہ ایک ہی موسم میں آ سکتا ہے - البتہ معاشری حیثیت سے میں اس طرح کی تمام

تقریبوں کا قایل ہوں اور اگر کوئی شخص ان کی پابندی کرے تو اہل مذہب کو دخل دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ انسانی نظام تمدن کے اس شعبہ سے وابستہ ہے جہاں مذہب کو بالکل سکوت اختیار کرنا چاہئے۔

آپ قوموں کے مراسم پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جن کا تعلق موسم سے ہے۔ چنانچہ انھیں میں سے ایک "نوروز" بھی ہے اس لئے اگر ایران کے مسلمان جہاں زمانہ قدیم سے عید نوروز منانے کی رسم چلی آتی ہے اس میں حصہ لیں تو اعتراض کا موقعہ نہیں ہے، لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کا "ایرانی نوروز" منانا البتہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیونکہ اس ملک کا نوروز وہی ہے جو یہاں کے موسم کے لحاظ سے ہندوؤں نے مقرر کیا ہے اور اس میں ضرور مسلمانوں کو شریک ہونا چاہئے۔

اس قسم کی سالانہ تقریبیں ہمارے نظام معاشرت و تمدن کے لئے بہت مفید ہیں اور اس نوع کی اجتماعات سے علاوہ اتحاد و اتفاق یا تبادلۂ خیالات کے ولولۂ نشاط و عمل میں بھی تحریک پیدا ہوتی رہتی ہے جو دلیل ہے ایک قوم کے بقا و حیات کی۔

بہرحال میرے نزدیک "عید نوروز" کو "اسلامی عید" کہنا تو کسی طرح درست نہیں کیونکہ مذہب سے اس کا کوئی تعلق نہیں، البتہ اسے "ایرانی عید" یا "موسمی عید" کہکر ایران کے مسلمانوں کو ضرور اس میں حصہ لینا چاہئے جس طرح ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بسنت اور ہولی میں ہندوؤں کے ساتھ ساتھ جشن مسرت میں شریک ہونا ضروری ہے۔

ہندوستان کے شیعہ حضرات نے، محض اس لئے کہ ایران ان کے مذہب کا مرکز رہا ہے اور ہے دہائی اس قدیم رسم کو اپنے مذہب میں داخل کر لیا ہے ورنہ مذہب کو اس سے کیا تعلق۔

چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

اگر آپ چاہتے ہیں کہ دنیا کے امن و سکون کا راستہ معلوم کریں تو اسکو ملاحظہ فرمائیے

مادئین کا مذہب

وجود باری کے ثبوت میں بیمثل مضمون

حرکت کے کرشمے

اگر آپ قدرت کے کرشموں کی تفصیل دیکھنا چاہتے ہیں تو اسے ملاحظہ فرمائیں تینوں ایک ہی جلد میں ضخامت ۲۰۰ قیمت معہ محصول عمر

باب الاستفسار

ازدواج بے خلوت

(جناب خواجہ اختر حسین صاحب پٹنہ)

گذارش خدمت ہے کہ وہ دو ہستیاں جو ازدواجی زندگی کے رشتہ میں منسلک کردیجاتی ہیں اگر اقتضائے فطرت کو جسکا مفہوم بقائے نسل ہے اپنی شب عروسی سے کلیتاً عمل میں نہ لائیں (خواہ ان کا یہ عمل کسی ایک جانب سے ہو یا باہمی رضامندی سے) اور اُن کا مطمح نظر بھی دنیا کے اس متذکرہ نظریہ سے بالکل علٰحدہ اور جدا ہو تو کیا ان کے درمیان عالمگیر محبت کی نشو دنما ہو سکتی ہے۔ اور ایک دوسرے کے جذب وکشش کا مرکز بن سکتی ہیں؟ مہربانی فرما کر آپ ہر دو صورتوں میں اس کے اسباب وعلل سے مطلع فرمائیں

(نگار) میں نے آپ کا استفسار کئی بار پڑھا اور ہر مرتبہ کوشش کی کہ اس کا صحیح مدعا ذہن نشین ہو جائے لیکن اپنی کامیابی کا مجھے کبھی یقین نہیں ہوا۔ آپ کی تحریر کا مفہوم بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ "اگر شادی کے بعد میاں بیوی خلوت صحیحہ کے تعلقات سے علٰحدہ رہیں تو باہمدگر محبت قائم رہ سکتی ہے یا نہیں"۔۔۔۔۔ لیکن آپ کے اس فقرہ سے جس میں آپ نے "اقتضاء فطرت کا مفہوم "بقاء نسل" قرار دیا ہے میں یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ کہیں آپ کی مراد "قطع پیدائش" یا (Birth Control) سے تو نہیں ۔۔۔۔ اسی کے ساتھ "عالمگیر محبت کے نشو دنما" والا فقرہ بھی الجھن میں ڈالنے والا ہے۔ ممکن ہے آپ کا مدعا اس سے یہ ہو کہ تعلق جنسی پیدا نہ کرنے کے بعد ساری دنیا سے محبت کرنے کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے یا نہیں۔

بہر حال ان میں سے جو مفہوم بھی ہو، بہت غور طلب ہے اور کافی بحث چاہتا ہے۔ گو اس وقت میں اسکے لئے طیار نہ ہوں ۔۔۔۔

اس مسئلہ میں سب سے پہلے "شادی" یا فلسفۂ ازدواج پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے آپ اس کے مخالف ہوں، لیکن، جیسا کہ بارہا میں نگار کے صفحات میں ظاہر کر چکا ہوں، میرے نزدیک شادی کا تعلق محبت سے ہو ہی نہیں سکتا، اور نہ محبت کے اصول پر رشتۂ ازدواج قائم کرنا کوئی فعل مستحسن ہے۔

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو "محبت و حسن" کا مفہوم محض "خیالی غیر مادی" قرار دیکر ان کو کسی اور دنیا کی چیز ظاہر کرتے ہیں بلکہ میرے نزدیک (جہاں تک مرد و عورت کا تعلق ہے) "محبت" شاعرانہ نام ہے صرف واہش جنسی" کے ہیجان کا اور "حسن" سے مراد ہے صرف وہ "محل یا مصرف" جہاں ہم اپنی "خواہش جنسی" کے ہیجان کا علاج چاہتے ہیں۔ یہ میں اسی دنیا کی باتیں کر رہا ہوں۔ عالم لاہوت وغیرہ کا ذکر نہیں جہاں "حسن مجرد" اور شق حقیقی" وغیرہ کی بہت سی نہ سمجھ میں آنے والی اصطلاحیں گھڑ لی گئی ہیں ——

پھر جب محبت سے مراد صرف "ہیجان نفس" ہوا تو محبت کے اصول پر شادی کرنے کے یہ معنی ہوں گے کہ جس وقت یہ خواہش پوری ہو جائے گی نکاح کی بھی اہمیت جاتی رہیگی اور اس غریب کی بھی جسے صرف خواہش فسانی کے پورا کرنے کا ذریعہ سمجھکر بیوی بنایا گیا تھا۔ ممکن ہے آپ کو یہ بات بہت عجیب معلوم ہو، لیکن یورپ لی موجودہ ازدواجی زندگی کو دیکھئے اور پھر فیصلہ فرمائیے کہ جو کچھ میں نے عرض کیا اس میں کس حد تک صداقت پائی جاتی ہے —— مغرب نے ہمیشہ مشرق کے مقابلہ میں یہی فخر کیا کہ اس نے عورت کی سطح کو بہت بلند کر دیا اور شادی کو محبت کے اصول پر قائم کر کے "جنت ارضی" کا مالک بن گیا، لیکن نگاہ حقیقت شناس بخوبی واقف ہے کہ اس کے یہ دونوں دعوے غلط ہیں، عورت کے ساتھ عیسوی مذہب اور عیسوی جماعت نے جو جو بدسلوکیاں روا رکھیں اور دنیائے معاشرت میں جس پستی تک اسے پہونچا دیا اس کے متعلق تو ہم آئندہ اشاعت میں مفصل تحریر کریں گے، لیکن "نکاح" کے سلسلہ میں "محبت" کی یا "محبت" کے سلسلہ میں "نکاح" کی جیسی مٹی انھوں نے پلید کی ہے، اس کو تو آپ اسی وقت سمجھ لیجئے اور مغرب کے اخباروں کو اٹھا کر دیکھئے کہ یہ محبت کی بنا پر شادی کرنے والے کیا کر رہے ہیں اور کس عذاب میں مبتلا ہیں۔ عبدالماجد دریا بادی نے تو خیر کئی مہینے صبر کیا، مگر وہاں تو بسا اوقات ایک رات بھی صلح و آشتی سے بسر کرنا دشوار ہو جاتا ہے اور طلاقوں کا شمار نکاح سے زیادہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کا سبب وہی ہے جو ابھی بیان کیا گیا کہ وہاں تعلق ازدواج کی اہمیت کا اندازہ جذبۂ محبت کی بنا پر کیا جاتا ہے اور محبت چونکہ ہیجان نفس کا "تجارتی نام" ہے اس لئے یہ سودا جو پہلے بڑی خوشی خوشی کیا جاتا ہے بعد کو بلائے جان ہو جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ محبت میں بڑی لذت ہے لیکن اس لذت کا فلسفہ صرف یہ ہے کہ جس ہستی سے جذبۂ محبت یا ہیجان نفس متعلق ہو جاتا ہے وہ ہمارے لئے عسیر الحصول ہوتی ہے یا یہ کہ ہماری نہیں ہوتی اور ہم میں اس کی جستجو پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر جب وہ حاصل ہو جاتی ہے تو ہم میں قدرتاً یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ بالکلیہ اس پر قابض ہو جائیں

اور کسی اور کے تصرف کے لئے اسے شجر ممنوع قرار دیدیں۔ پھر یہ قبضہ یا تصرف جس قدر شدید و قوی ہوگا اتنی ہی کمی محبت میں پیدا ہو جائے گی اور چونکہ ازدواج کا رشتہ ایک عورت کو پوری طرح مرد کے قابو میں لے آتا ہے اسلئے محبت بھی پوری طرح ختم ہو جاتی ہے اور اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ نکاح سے زیادہ لذات کی دشمن کوئی چیز نہیں ایک بازاری یا دوسری عصمت فروش عورت کے ساتھ مواصلت کے بعد بھی خواہ وہ کیسی ہی معمولی چیز کیوں نہ ہو، یک گونہ ہیجان یا تعلق شیفتگی قائم رہتا ہے صرف اس لئے کہ اسپر تصرف کامل نہیں ہوتا اور رقابت کی آگ مشتعل رہنے کے اسباب پیدا ہوتے رہتے ہیں، برخلاف اس کے گھر میں بیوی خواہ کتنی ہی جمیل و خوش ادا کیوں نہ ہو اس کی طرف میلان باقی نہیں رہتا محض اس وجہ سے کہ وہ چیز اپنی ہے اور بالکل اپنی۔ یہی وہ فلسفہ ہے جس کی بنا پر ایک عورت کی خوبی یا دلکشی کا نظریہ صرف یہ قرار دیا جاتا ہے کہ "عورت ہو اور پرائی"۔

اس لئے اگر ہم کسی عورت سے صرف جذبۂ محبت کی بنا پر شادی کریں گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مواصلت کے بعد وہ کیفیت ختم ہو جائے گی اور اس کی طرف سے احتراز پیدا ہونے لگے گا۔ لیکن اگر نکاح کو سوسائٹی کی ضرورت سمجھ کر عمل میں لایا جائے اور محبت و عشق کا جھگڑا درمیان میں نہ ڈالا جائے تو کوئی الجھن پیدا نہیں ہو سکتی اور نہ بعد و افتراق کی نوبت آ سکتی ہے۔

بیوی کو معشوقہ بنا کر رکھنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن اس کو معشوقہ سمجھنا سخت اصولی غلطی ہے۔ آپ نے اگر اسے صرف "تعلق جنسی" کا ذریعہ یا آلہ سمجھا تو چند دن میں وہ بالکل بے مزہ چیز ہو کر رہ جائے گی، لیکن اگر اس کو رفیق حیات، مشیر زندگی، اور ایک پر خلوص دوست کی حیثیت دی گئی تو امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ تعلق اور زیادہ قوی ہوتا جائے گا اور رشتۂ ازدواج کی اہمیت کا صحیح اندازہ آپ کو ہونے لگے گا۔

اب اس تمہید کے بعد میں آپ کے استفسار پر غور کرتا ہوں ——— آپ فرماتے ہیں کہ اگر رشتۂ ازدواج کے بعد اقتضائے فطرت کی طرف اعتنا نہ کیا جائے اور میاں بیوی دونوں تعلق جنسی سے علیحدہ رہیں تو کیا جذبات محبت قائم رہ سکتے ہیں یا نہیں۔ اس کے جواب میں مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ہرچند اس صورت میں کوئی استحالۂ عقلی تو نہیں پایا جاتا، لیکن اسکو ہم "محال عادی" ضرور کہہ سکتے ہیں۔ علاوہ اس کے یہ صورت کچھ مناسب بھی نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ رشتۂ ازدواج کا ایک مقصود بقائے نسل بھی ہے اور اگر اس کو نظر انداز کر دیا گیا تو پھر مرد و عورت کی زندگی ایک سنسان بے آب و گیاہ صحرا سے زیادہ نہیں رہتی۔ اولاد ہی وہ چیز ہے جو نظام تمدن سے نوع انسانی کی وابستہ کئے ہوئے ہے۔ اور اسی کا وجود ہم کو بتاتا ہے کہ دنیا میں صحیح محبت کس چیز کا نام ہے۔ آپ پوچھتے ہیں کہ "کیا اس سے عالمگیر محبت کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے"۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بے تعلقی خود اپنے نفس سے بھی چند دن میں انسان کو بیزار کر دینے والی ہے، چہ جائیکہ "عالمگیر محبت" کا جذبہ پیدا ہونا

ہاں میں اس کا ضرور مخالف ہوں کہ ضرورت سے زیادہ اولاد پیدا کی جائے۔ اور اگر تعلق جنسی قطع کر دینے کے علاوہ کوئی اور صورت کثرت اولاد کو روکنے کی نہیں ہو سکتی، تو میں پھر اس تعلق سے بھی باز رکھنے کا مشورہ دوں گا، کیونکہ اس وقت ہمارے متعدد اسباب نکبت و افلاس میں ایک بڑا سبب یہ بے تکا پن بھی ہے کہ اپنی مالی حالت کا اندازہ کئے بغیر اولاد پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔ اگر زندگی کا مقصود صرف اولاد پیدا کرنا ہے۔ بلا لحاظ اس کے کہ ہم اُن کی تعلیم و تربیت یا صحیح نشو و نما کے ذرائع رکھتے ہیں یا نہیں، تو خیر، ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس سلسلہ کو ایک خاص حد سے آگے بڑھنے دیں۔ خواہ اس کے لئے ہم کو تعلق جنسی ہی سے کیوں نہ تائب ہونا پڑے۔

آپ اس ماہ کی اشاعت میں مسٹر محمد عاقل ایم، اے کا ایک مضمون ملاحظہ فرمائیں گے جس میں "آبادی" کے مسئلہ پر نہایت فاضلانہ گفتگو کی گئی ہے، اس لئے میں ضرورت نہیں سمجھتا کہ ان اشارات سے آگے بڑھوں آپ اس مضمون کو غور سے پڑھئے اور معلوم کیجئے کہ "بقاء نسل" سے کیا مراد ہے اور "کثرت اولاد" ممکن ہے "بقاء نسل" ہو لیکن بقاء قوم و انسانیت نہیں۔

کاجل - سرمہ - چورن - منجن

اڈیٹر صاحب نگار نے خود ان دواؤں کا اطمینان کر کے اپنی رائے ان کے مفید ہونے پر اکتوبر کے ملاحظات میں ظاہر کی ہے۔

دوسری تازہ سند ملاحظہ ہو:- سرمہ ضعف بصارت وغیرہ کے لئے بہت مفید ہوا ایک شیشی اور بھیج دیجئے۔

کاجل - آشوب سرخی، ضعف بصارت کے لئے ازبس مفید ہر ایک ڈبیہ جو ایک شخص کیلئے سال بھر کو کافی ہو قیمت عہ **سرمہ** - یہ بیش بہا سرمہ چالیس دن میں تیار ہوتا ہے اس میں نہ ممیرہ ہے نہ کوئی معمولی سرمہ ہے جن کو جڑی بوٹیوں کے عرق میں سائیں کر تیار کیا جاتا ہے۔ اس کے فوائد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جالا، دھند، موتیا بند اور ضعف بصارت صرف ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہے اور بارہا آزمایا ہوا ہے قیمت فی پڑیہ عہ علاوہ محصول - **چورن** - یہ وہ اکسیری چیز ہے جس کا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے پیٹ کا درد، قبض، نفخ ریاح کا پیدا ہونا سوء ہضم، دستوں کا آنا سب یک لخت اس کے استعمال سے جاتا رہتا ہے کیسا ہی شدید درد پیٹ میں ہو ایک چٹکی کھا لینے سے جاتا رہتا ہے۔ قیمت فی ڈبہ آٹھ تولہ عہ علاوہ محصول **منجن** - اس کی ادنیٰ خوبی یہ ہے کہ ہلتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں۔ قیمت فی ڈبہ ۸ تولہ ایک روپیہ علاوہ محصول -

نوٹ:- سب چیزیں منگانے والوں کو محصول ڈاک معاف

پتہ:- ہم بیگم ذریعہ رسالہ نگار لکھنؤ

سیر محشرستاں

(یہ نظم مثنوی ابر گہربار دیکھنے کے بعد لکھی گئی)

عزم تھا سیر محشرستاں کا — دل میں طوفان شوق و ارماں کا
بیٹھے دل وقفِ سوز و ساز ہوا — پھر تخیل کرشمہ ساز ہوا
پی کے اک معرفت کا پیمانہ — کیفِ عرفاں میں بے حجابانہ
وادیِ مہر و ماہ سے گزرے — ہر جنوں خیز راہ سے گزرے
گفتۂ قلبِ ناصبور کیا — ہفت افلاک کو عبور کیا
گھوم کر ساری جلوہ گاہوں سے — آخرش حشر گاہ میں پہنچے
مجتمع تھا ہجومِ بے پایاں — دم بخود تھے تمام پیر و جواں
ایستادہ تھے سب امیر و فقیر — فکر میں غرق تھے صغیر و کبیر
دیدنی تھا ہر ایک چہرۂ زرد — ہونٹ تھے خشک اور جسم تھے سرد
ہر بشر خوف سے پریشاں تھا — روح لرزاں تھی جسم لرزاں تھا
تل رہے تھے ہر ایک کے اعمال — ہر بشر تھا غم و الم سے نڈھال
تختِ ذی شاں جلال آرا تھا — داورِ حشر جلوہ فرما تھا

یک بیک ایک بندۂ آزاد — راست قد، خوبرو و شوخ نہاد
یعنی وہ شاعرِ طلسم نگار — غالبِ نکتہ سنج و بادہ گسار
عجب اندازِ بے قراری سے — یعنی اک شانِ وضعداری سے
چیر کر سب ہجوم کو نکلا — اور بصد احترام یوں بولا
اے خدائے جہان کے معبود — ناظمِ عرصۂ ہبوط و صعود:
سارے احوال تجھ پہ ظاہر ہیں — میرے اعمال تجھ پہ ظاہر ہیں
جانتا ہے حریفِ ہوش ہوں میں — کشتۂ ذوقِ ناؤنوش ہوں میں
عمر پینے میں سب بسر کی ہے — زندگی میکشی میں کھو دی ہے!
عاشقِ بادۂ مجاز ہوں میں — پیکرِ شوق جاں گداز ہوں میں
فردِ اعمال میں دھرا کیا ہے — اس کی پڑتال میں دھرا کیا ہے
گر جہنم میں بھیجنا ہے مجھے — تو بھلا اس میں عذر کیا ہے مجھے
جس کا دل دوزخِ سراپا ہو — کیا جہنم کا اس کو دھڑکا ہو
تجھ سے پوشیدہ حالِ زار نہیں — حسرتوں کا کوئی شمار نہیں
ذکرِ آلام و بیکسی کیا ہے — نامرادوں کی زندگی کیا ہے
بخش دیجے، نہیں ہے تابِ شکیب — کھا چکا ہوں تمام عمر فریب
مجھکو انصاف کا خیال بھی ہے — دل مگر وقفِ احتمال بھی ہے
کیا کروں دل نہ مانتا ہو جب — عدل ہے ایک لفظِ بے مطلب

یاد ہے تجھکو عادلِ یکتا — ماجرا میری جاں نگاری کا
آہ وہ حشر آفریں راتیں — برق و باراں کی دلنشیں گھاتیں
وہ گھٹاؤں کا کیفِ وجدانی — وہ فضاؤں میں مے کی طغیانی
نغمہ ہائے طرب سے حشر بدوش — آہ وہ میکدہ کا جوش و خروش
لغزشوں کا ہجومِ مستانہ — مستیوں کا شعارِ رندانہ
گلرخوں کی ادائیں بہکی ہوئیں — مطربوں کی نوائیں بہکی ہوئیں
عیش کا شادمانیوں کا سماں — حشر آرا جوانیوں کا سماں
لیکن اُس کیف زارِ عشرت میں — موسمِ زر نگارِ عشرت میں
آہ وہ میرے گھر کا حالِ خراب — زندگی تھی کہ ایک طرزِ عذاب

سچ تو یہ ہے کہ شق ہیں قلب و جگر — روح میں جذب ہیں الم کے شرر
مجھ کو جنت میں بھی اگر بھیجا — دل وہاں کیا لگیگا اب میرا
خلد و دوزخ کی جب نہیں پروا — کس طرح ہوگا فیصلہ میرا
گر اشارہ کسی فرشتے سے — جا کے دو چار مے کے خم لادے
جب تلک بزم حشر گرم رہے — بادۂ جانفزا کا دور چلے
سن رہے تھے یہ خطبۂ رنگیں — ہمہ تن گوش ہو کے پاس کہیں
رندِ آزاد، حضرتِ خیام — بولے با اضطراب و شوق تمام

خیر جو ہوگا دیکھا جائے گا — فکر کیا حشر کے نتیجے کا
ہاں مگر تا ہنوز اے غفار — اپنے اعمال پر ہیں ہم مختار
خون دل کس لئے پئیں پھر ہم — تشنہ لب کس لئے جئیں پھر ہم
حشر میں میکشی ضروری ہے — آپ کی گفتگو اصولی ہے

عدم

نشاطِ روح

سوائے درد نہیں اور حسرتِ بیمار — نشاطِ روح تمنا ہے لذتِ آزار
کہاں ہے موجۂ مے میں وہ شوخیِ رفتار — ہزار جام پہ بھی ہے فسردگیِ خمار
بہار میں بھی ہوں بیگانۂ نشاطِ بہار — مرے شباب میں ہے زہر خندۂ بیمار
مرا تبسمِ بے کیف۔ گریۂ خاموش — شگفتگیِ دل۔ افسردگیِ شمعِ مزار
یہ سوچتا ہوں کہ انجام کار کیا ہوگا — ابھی سے موجِ نفس میں ہے رنگ کاوشِ خار
شریکِ حسن اگر ذوقِ خود نمائی تھا — نگاہِ شوق کو دینی تھی طاقتِ دیدار
شگفتگی ہے نثار ایک ایک ذرے پر — نسیم صبح بھی کس کی لطافتِ رفتار
نوائے پردۂ دل ہے رہینِ سازِ الست — ہنوز روح فزا ہے وہ لذتِ گفتار
قصورِ عشق نہیں شکوہ سنجیِ کوکب — متاعِ دل ہی ہے اے دوست گرمیِ بازار

کوکب شاہجہانپوری

چاند

اے نگارِ مہ جبیں! اے شمع بزم لامکاں
اے بت سیمیں تن! ای انجم و چراغ آسماں

ہیں ترے شایانِ شاں ای آسماں کے تاجدار!
یہ قصورِ نیلگوں، یہ تخت و تاجِ زرنگار

یہ کمالِ حسن تیرا اور یہ نورانی شباب
اللہ اللہ اس قدر بے پردۂ عریاں بیحجاب

سطحِ دریا پر بہار جلوۂ مہتاب ہے
یا بجھی پانی پہ یہ اک چادرِ سیماب ہے

وہ ترا گرداب کے حلقوں میں رقصِ جلوہ پاش
وہ تری موجوں کے جھرمٹ میں ادائے ارتعاش

شیشۂ سیال میں وہ عکسِ مہتابی ترا!
موج کی آغوش میں وہ رقصِ سیمابی ترا!

ای بت ساغر بکف! اے ساقی مینا بدوش
اے بہار میکدہ! اے آرزوئے بادہ نوش

تیرے ہی دم سے ہے صہبائے کہن میں کیف و جوش
تیرے ہی دم سے ہے شور انگیز بزم نائے و نوش

تیری ہی دم سے ہے شورِ مستی جامِ شراب
ترے ہی دم سے ہے کیفِ نغمۂ چنگ و رباب

ای مہِ شب تاب! ای انجم و چراغ کائنات!
ای مہ شب تاب! ای شمع شبستانِ حیات

میرے ویرانہ میں بھی کاش آئے دم بھر چاندنی
سایۂ اشجار سے آجائے چھن کر چاندنی

کس قدر جانِ محبت ہے یہ محبوبی تری
کس قدر جانِ شعریت ہے یہ محبوبی تری

یہ جمالِ دلربا یہ عارضِ سیمیں ترا
یہ عذارِ یاسمیں یہ خندۂ نوشیں ترا

تو نکلتا ہے تو بڑھ جاتی ہے بے تابی مری
مجھکو تڑپا دیتی ہے تقدیرِ سیمابی مری

مجھکو کر دیتا ہے سودائی یہ نظارہ ترا
دیکھتا رہتا ہوں میں روئے جمال آرا ترا

تو نکلتا ہے تو از خود رفتہ ہو جاتا ہوں میں
بیخودی شوق کی وسعت میں کھو جاتا ہوں میں

تیری کرنوں سے لپٹ جاتا ہوں میں مستانہ وار
چومتا ہوں عارضِ سیمیں ترا دیوانہ وار

گھر سے باہر جانبِ صحرا نکل جاتا ہوں میں
دل کے ذرہ ذرہ کو پھر جذب میں لاتا ہوں میں

اُس فضائے مست کو نغموں پہ سر دھنتا ہوں میں
تجھ سے پیغامِ محبت آفریں سنتا ہوں میں

تیری ان سیمیں اداؤں پر غرض مرتا ہوں میں
تیری ان جلووں سے دامانِ نظر بھرتا ہوں میں

تجھسے جب ہوتی ہیں خلوت کی ملاقاتیں مری　　ہائے تو کرتا ہے پھر کیا کیا مداراتیں مری
تو ہے جب تک مجھسے ہوتی رہتی ہیں باتیں مری　　یونہی کٹ جاتی ہیں ساری چاندنی راتیں مری
چھیڑتا ہوں داستان درد محبت کی کبھی　　شرح کرتا ہوں غم جانکاہ فرقت کی کبھی

اے مرے چاند! اے سراپا داغہائے سوز و ساز　　اے مری چاند! اے حبیب جاں نواز و دل نواز
کر دیا تیری محبت نے مجھے یوں بے نیاز　　اب نہیں اٹھتی کسی جانب نگاہِ پاک باز
ہو گیا حسن حقیقت کا مجھے عرفانِ راز　　اب نہیں کچھ جاذبِ ذوقِ نظر حسنِ مجاز

تو ہی اس عالم میں ہے میرا انیس و غمگسار　　تو ہی ہے اک مایۂ تسکینِ جانِ بیقرار
آشنائے درد پنہاں ہے شریک غم ہے تو　　محرم رازِ نہاں ہے مونس و ہمدم ہے تو
تو مرا آرام جاں ہے تو مرا محبوب ہے　　تو مری جان تمنا ہے، مرا مطلوب ہے
باوجود اس قرب کے بھی آہ تجھ سے دور ہوں　　اے مہ کامل! ترا میں عاشق مہجور ہوں
میرے پیارے چاند! آجا تو مری آغوش میں　　دوسرا کوئی نہیں اس وادی خاموش میں

آ کہ اب تجھ پر فدا ہو جاؤں میں پروانہ وار
آ ترے قدموں پہ یہ جانِ حزیں کردوں نثار

محمد یحییٰ (اعظم گڈھ)

زندگی کا طوفان

آسماں پر گھٹائیں چھائی ہیں　　کالی کالی بلائیں چھائی ہیں
دہشت انگیز خشمگیں بادل　　حشر زا حشر آفریں بادل
عالم طیش میں گرجتے ہیں　　یا جنوں کے رباب بجتے ہیں
غیظ آلود قہر خیز ہوا　　مرتعش اور تیز تیز ہوا
جب فضاؤں میں بڑبڑاتی ہے　　روحِ آفاق کانپ جاتی ہے

موت اس زندگی کے طوفاں میں　　بزم ہستی کے محشر ستاں میں
بجلیوں کی کڑک سے سہمی ہوئی
خوف سے سانس لے نہیں سکتی

باقی صدیقی (راولپنڈی)

ناتمامی

درست ہو نہ سکے کائنات کے اجزاء — حیات گرچہ رہینِ صد اضطراب رہی
اصولِ رزم سکھائے نظامِ بزم دیا — نگاہ شوخ بنی محرمِ حجاب رہی
کبھی ترانۂ آغاز و گاہ حزنِ مآل ہو — سکوتِ پیری و ہنگامۂ شباب رہی
کہیں فضائے تبسم میں اشکباری کی — فسردگی میں کبھی صرفِ آب و تاب رہی
کمال ناز بنی، نازشِ کمال ہوئی — نقابِ راز اُٹھایا، نہ نقاب رہی
نوائے مرغِ گلستاں کو دردمند کیا — کلی کی طرح کھلی صورتِ گلاب رہی
خوشی کے راگ سنائے سرشکِ درد بہائے — پیامِ امن ہوئی، درسِ اضطراب رہی
سحر کی بزم میں چھیڑا سرودِ بیداری — فضائے شام میں وقفِ نشاطِ خواب رہی
دلوں کو سوزِ محبت سے بہرہ مند کیا — حدیثِ مطرب و کیفِ شرابِ ناب رہی
کہیں و فورِ طرب سے نشاطِ روح بنی — فنا کی زد میں کبھی صرفِ پیچ و تاب رہی
کبھی تبسمِ دلکش، کہیں نگاہِ عتاب — سکونِ ماہ بنی، جوششِ آفتاب رہی
ہزار بار جلائے چراغِ امن و سکوں — ہزار مرتبہ، سرگرمِ انقلاب رہی
غرض ہزار طریقوں سے بزمِ گیتی میں — ستیزہ کار ہوئی موردِ عذاب رہی
مگر بایں ہمہ سعی و عمل گرہ نہ کھلی — حیات، موت کے ناخن کی زخم یاب رہی

ہجومِ ظلمت روزِ سیاہ ہو کے رہا
مآلِ کار گلستاں تباہ ہو کے رہا

علی اختر (حیدرآباد دکن)

صبح نورافروز

سحر انگڑائیاں لیتی افق سے اس طرح آئی　　　کہ ہر ذرہ پکار اُٹھا قیامت کی ہے رعنائی
جگایا نیند کے ماتوں کو آکر خوابِ راحت سے　　　خرامِ ناز ہے ہمرنگِ اعجازِ مسیحائی
دیا درسِ عمل بھی اور پیامِ کار بھی لائی
گلستانِ مسرت میں بہارِ آرزو آئی

نسیم سرد کے جھونکے بہ عنوانِ شراب آئے　　　گلوں میں مستیاں بھرنے بہ اندازِ شباب آئے
یہ مستی اور یہ اٹھکھیلیاں گلشن کی کلیوں سے　　　کہ جیسے پی کے متوالا کوئی خانہ خراب آئے
ادہر معصوم غنچے شرم سے گردن جھکاتے ہیں
اُدہر جھونکے ہوا کے چوم کر منہ جھوم جاتے ہیں

طیورِ خوش نوا کے ساز میں ساری فضا گم ہے　　　طرب انگیز نغمے ہیں، نشاط آگین ترنم ہے
صبوحی پی چکے نخلِ چمن سرشار ہیں پتے　　　گلوں کے قہقہے ہیں اور غنچوں کا تبسم ہے
گلستاں میں نمو ہے، وجد میں سارا زمانہ ہے
زمانے کی زباں پر اب مسرت کا ترانہ ہے

خدا معلوم کتنی سیلِ نوری میں روانی ہے　　　فضاؤں پر فدا دل سے بہارِ بوستانی ہے
زمیں کا گوشہ گوشہ بنگیا صہبا اثر جنت　　　ہر ایک ذی روح کو حاصل سکونِ جاودانی ہے
اذاں مسجد میں، گرجا میں گجر، ناقوس مندر میں
دلاتے ہیں کسی کی یاد وقتِ روح پرور میں

ردائے شب اٹھی اب شرق سے پیرِ مغاں آیا　　　لرزتے ہاتھ میں لیکر شرابِ ارغواں آیا
پھلوں پھولوں کو سبزے کو عجب نقش بنایا ہے　　　جہانِ رنگ و بو لیکر چمن کا پاسباں آیا
شعاعِ مہر کی زرکاریاں کندن چڑھاتی ہیں
طلائی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہر شے دکھاتی ہیں

شفق نے اس طرح آکر لگا دی آگ ظلمت کو　　　کہ گھیرا سرخ شعلوں نے زمانے بھر کی وسعت کو
ستارے کھو چکے اپنی متاعِ صبر و طاقت کو　　　زمیں پر رشک آتا ہے فضائے باغِ جنت کو

بہار آگئیں فضاؤں سے بنا کیف نظر جنت
یہاں جنت، وہاں جنت، اِدھر جنت، اُدھر جنت

فضا پر حسن چھایا ہے نظر افروز دنیا ہے — کہ ہر ذرہ جمال آگئیں مناظر کا سراپا ہے
نیاز و ناز کی پابندیاں بھی اب مٹیں فطرت — کوئی مصروفِ آرائش، کوئی محوِ تماشا ہے

تصور ہے کسی کے آج ہم آغوش ہیں بھی ہوں
شراب آتی ہے خود مجھ تک عجب مدہوش ہیں بھی ہوں

فطرت واسطی

تبصرہ

طفلی تو گئی تھی شادمانی رہتی ! — کچھ روز بہار شادمانی رہتی !
پیری نے بھی آکے بیوفائی برتی — گزرے ہوئے عیش کی کہانی رہتی

طفلی کی بھی نیند بے ضرر تھی واللہ — صہبائے شباب طرفہ تر تھی واللہ
بینی ہی پڑی یہ درد پیری آخر — نفرت جس سے کہ عمر بھر تھی واللہ

بچپن کا سماں تو بیخودانہ گزرا — اور عہدِ شباب والہانہ گزرا
کس حال میں کٹتی ہے یہ پیری دیکھو — اب تک تو مزے ہی کا زمانہ گزرا

امین حزیں

غزل

آنکھوں میں لیکے جلوۂ حیرت اثر کو میں — اللہ جانے آج چلا ہوں کدھر کو میں
لائی عدم سے عرصۂ ہستی میں قیدِ زیست — اہلِ وطن سے چھوٹ گیا عمر بھر کو میں
دیر و حرم تو راہ تجسس میں رہ گئے — اے بیخودی بتا کہ چلا اب کدھر کو میں
ہر نقش پا پہ رکھکے جبینِ نیاز کو — آنکھوں سے چومتا ہوں تری رہگزر کو میں
کیا علم تھا کہ وقت پہ ہو جائیگا حجاب — کرتا شریکِ دیدہ اپنی نظر کو میں

افسر بساطِ صبر و تحمل کو جانچ لوں
دیکھوں گا پھر جمال تحیر اثر کو میں

افسر صدیقی (امروہوی)

و اور حالتیں بے برادر اور بے انیس سونے کی نہایت خوبی سے مذکور ہوئی ہیں۔

(مولف) مجیب نے اپنے قاعدہ کے موافق چھ جواب دیئے ہیں۔ جن کی حالت یہ ہے کہ پہلے جواب میں کہتے ہیں کہ ہائے مختفی نسبتی اور تعین مقدار کو ایک ہی تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ یہ دلیل قابل تسلیم ہے مگر قاعدہ یونہی جاری ہے جیسا کہ معترض نے کہا ہے لہذا یہ اعتراض دور نہیں ہو سکتا۔ (دوسرا جواب) کہ چند روزہ چند ہفتہ صفت بعد صفت ہیں۔ جس کے ثبوت اور سند میں بدر جاجی کا شعر لکھا ہے۔ اس واسطے غلط ہے کہ یہ صفت بعد صفت نہیں ہے۔ ہر صرف اور نحو کا جاننے والا اس کو سمجھ سکتا ہے صفت بعد صفت کی مثال یہ ہے کہ زید عالم و عادل ہے۔ اس شعر کی اصلی ساخت یوں ہے۔ کہ "ما بے برادر و بے انیس چند روزہ و چند ہفتہ یادگار زندگاں و مہمان جہاں ہستیم" معلوم اس میں صفت بعد صفت کیونکر پیدا ہو گئیں ہائے ظرفیت و ہائے تعین مقدار کا جواب بھی کوئی نہیں دیا گیا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جب معترض صفت بعد صفت کو مانتا ہی نہیں تو پھر یہ کہنا اسکے لئے بیکار ہے کہ عطف کی ضرورت نہیں ہے اس مصرع میں "چند روزہ چند ہفتہ بے برادر۔ بے انیس" بغیر عطف کے کام ہی نہیں چل سکتا۔ یہ اعتراض کہ اعلان اور اشباع حرکت ماقبل ہائے مختفی مذموم ہے۔ جائز نہیں ہے نہ معترض کا یہ خیال ہے بلکہ وہ غیر فصیح کہتا ہے اس کے لئے چنداں سند کی ضرورت نہیں تھی پانچویں اور چھٹے جوابات صرف معنوی خوبیوں کے دکھلانے کے لئے دیئے گئے ہیں۔ حالانکہ وہ اس وقت تک بیکار ہیں جب تک کہ شعر کی ترکیب درست نہ ہو۔ غرض یہ کہ اعتراض نہیں اٹھ سکا۔ اور چند روزہ کی طرح چند ہفتہ کے معنے چند ہفتہ کے لئے نہیں نکلے۔ چند ہفتہ مہمان ہستم کی ترکیب بغیر رائے کے صحیح نہیں۔

مرزا دبیر۔ الوداع اے شوق تصنیف الفراق اے ذوق نظم ششدر حواس خمسہ و دہ عقل ششدر رہے ہیں

اعتراض۔ مصنف اپنے حواس خمسہ اور دہ عقل کے ششدر ہونے کی وجہ سے شوق تصنیف کو الوداع اور الفراق فرماتے ہیں۔ پس مرزا صاحب کی دس عقلیں کون ہیں اور اگر وہ عقل سے عقول عشرہ مسلمہ حکما مراد ہیں تو معنے بے ربط ہوئے جاتے ہیں۔

جواب۔ دہ عقل سے مراد عقول عشرہ مصطلحہ حکما ہیں اور حواس خمسہ سے بھی علی العموم تمامی عالم کے حواس خمسہ مراد ہیں اور اس طرح معنے بلیغ اس شعر کے یہ ہیں۔ کہ چونکہ غم فراق میر انیس صاحب میں کل عقول عشرہ اور کل حواس خمسہ تمام عالم کے ششدر رہے تو اسلئے اس ضمن میں مصنف پر بھی بڑا اثر پڑا اور یہ وجہ خاص بسبب الوداع اور الفراق نسبت شوق تصنیف و ذوق نظم کے کہدینے کی ہے دوسرے یہ ممکن ہے کہ مراد مصنف یہ ہو کہ حواس خمسہ مصنف کے جو ذریعہ استفاضۂ مضامین عالیہ تھے اور کل عقول عشرہ ہیں سے عقل عاشر

مبدا ٔ فیاض عالم مضامین بھی خیال کیجاتی ہے اس غم میں ششدر رہیں اور اس وجہ سے باب استفاضہ وافاضہ مضامین بالکل مسدود ہوگیا ہے جس کی وجہ سے شوق تصنیف اور ذوق نظم سے اب جدائی اختیار کرنا ضرور ہے۔ کیونکہ ان سے فائدہ ممکن نہیں ہے۔

(مولف) یہ صرف تاویلیں ہیں۔ ورنہ اصل میں معترض کے اعتراض کا کوئی جواب نہیں۔ اگر عقول عشرہ سے عقول مسلمہ حکماہی مراد لیجائیں تو یہ اعتراض ہوتاہے کہ وہ عقول عشرہ اور حواس خمسہ عالم کیا سوائے شعرگوئی کے اور کوئی کام نہ کرتی تھیں ورنہ اب وہ معطل اور بیکار رہیں تو اس کے کیا معنے کہ شعرگوئی اور تصنیف کا دروازہ تو بند ہے۔ باقی سب کام بدستور جاری ہیں۔ دوسرا جواب یہ کہ عقل عاشر یعنی مبدا ٔ فیاض عالم بھی معطل ہے میرے نزدیک تو سخت گناہ ہے۔ فاضل مجیب کے نزدیک میر انیس کے مرنے میں اگر عقل عاشر ششدر اور حیران ہے تو ہو۔ باقی اور کوئی تو شاید نہ مانے۔ باقی دو جوابوں میں مجیب نے وہی تاویلی معنی بیان کئے ہیں جن کا لکھنا طوالت ہے۔

مرزا دبیر۔ بسکہ در بزم بسوزد داغ غم بالائے داغ   نیست جز طاؤس در پروانہ دیگر بے انیس

اعتراض۔ اس شعر میں پروانہ موصوف اور دیگر صفت ہے۔ لہٰذا علامت موصوف کی آخر پروانہ میں ضرور چاہیئے اور روشن ہے کہ بدوں شمع کے پروانہ بے لطف اور بیکار ہے۔ اور طاؤس کو بزم سے کیا مناسبت ہے اس کو اگر سروکار ہوتا ہے تو باغ سے ہوتاہے نہ کہ کسی محفل اور مجلس سے۔

جواب۔ (۱) ترکیب توصیفی اگر مان لی جائے تو اُس کا حذف جائز ہے جیسے کہ خسرو کا یہ شعر ؎

بیچارہ خسرو خستہ را خوں ریختن فرمودہ است   خلقے بمنت یکطرف آں شوخ تنہا یکطرف

(۲) علامت اضافت اور ترکیب توصیفی کا فارسی میں ایک حال ہے اور فک کسرہ ہائے مختفی کا بحالت اضافت صحیح منصور ہو کر کلام اساتذہ اہل زبان میں اکثر واقع ہوا ہے نظامی ؎

توئی کافریدی زیک قطرہ آب   گہرہائے روشن تر از آفتاب

اور دوسروں نے بھی ایسا کیا ہے مولانا روم ؎

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد   میلش اندر طعنۂ پاکاں دہد

(۳) اس شعر میں نیست کو بطور ایک فعل ناقص کے فعل رابط اور پروانہ کو اس کا اسم اور دیگر کو خبر کہدینا ایک صاف جواب ہے اس صورت میں حذف اضافت کے تسلیم کی بھی ضرورت نہیں۔

(۴) پروانے کے لئے شمع چاہیئے اور شمع داغ کو بھی کہہ سکتے ہیں۔ لہٰذا پروانہ کا ذکر بے لطف نہیں ہے۔

(۵) طاؤس کے ذکر سے مراد یہ ہے کہ پروانے سب فنا ہو گئے۔ اور چونکہ طاؤس بھی داغدار ہوتا ہے اس واسطے
دل کے ساتھ اس کی تشبیہ ہو سکتی ہے۔

(مولف) اس شعر میں مجیب نے جس قدر جوابات دیئے ہیں وہ قریب قریب ایسے ہیں کہ ضرورت پر اُن کو مانا
جا سکتا اور تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

مرزا دبیر۔ سوخت بر آتش دل یاراں اگر مثل سپند — نالہ آہستہ می آید ز مجمر بے انیس

اعتراض۔ شے مرغوب و محبوب کے دفع عین الکمال کے لئے سپند جلانا مرسوم ہے نہ کہ وفات میں اور جبکہ
[ک]وئی جلتا ہے تو بلا ضبط اور بلا اختیار بشور و فغاں نالہ بلند ہوتا ہے۔ پس مجمر سے نالہ آہستہ آنا کیا معنے۔

جواب۔ اس میں دل یاراں کے جلنے کا ذکر ہے اور اس کی تشبیہ سپند کے جلنے سے دیگئی ہے۔ سپند کے
[ج]لانے کا خیال نہیں (۲) گو ایسے حال میں سپند جلانے کا مرسوم نہیں ہے۔ مگر سپند دل یاراں کے جلنے
[ک]ا تو ضرور دستور ہے۔ پس معترض کا اعتراض غلط فہمی پر مبنی ہے کہ یہ نہیں دریافت کیا گیا ہے کہ یہاں ذکر
[آت]ش مجمر غم اور آتش شورش و الم اور سپند دل زار یاران وفادار کا ہے نہ کہ معمولی سپند اور مجمر وغیرہ کا۔ (۳) سپند
[ک]ے جلنے کا ذکر علی العموم وہاں کیا جا سکتا ہے جہاں کسی شے کے جلنے کی تشبیہ دیجائے۔ چنانچہ اساتذہ کے یہ شعر

[خ]الص۔ مانند سپندے کہ بر آتش بنشیند — با یار نشستیم چہ بسیار نشستیم
[س]عدی۔ آتش سوزاں نکند با سپند — آنچہ کند دود دل مستمندا

(۴) بزم کی مناسبت سے جو پہلے شعر میں ہے سپند اور مجمر لایا گیا (۵) یوں بھی معنے اس کے کیے جا سکتے ہیں
[ک]ہ جس مجمر اور جس بزم میں اس سے پہلے دفع چشم بد کے واسطے سپند جلانے کا دستور تھا اس پر اب یار دل کا
[ا]س جلتا ہے۔ اس صورت میں سپند کا ذکر انسب ہو گا۔ (۶) نالہ مجمر کی آہستگی کا ذکر اسباب پر دلالت کرتا ہے
[ک]ہ یاروں کا دل زار ہو گیا ہے (۷) جب کوئی شے جل کر ختم ہونے کے قریب ہوتی ہے تو اس کی آواز آہستہ
[ہوت]ی ہے۔ (۸) اگر جلنے والے کا نالہ شور و فغاں کے ساتھ تسلیم کیا جائے تو یہاں تو مجمر کے نالہ کا ذکر ہے۔ (۹) شاعر
[ن]ے اگر نالہ مجمر آہستہ سنا تھا تو اُسے آہستہ ہی ذکر کرنا چاہیے۔

(مولف) کوئی جواب مطمئن کرنے والا نہیں ہے۔ اس واسطے معترض کا اعتراض اپنی جگہ پر قائم ہے

مرزا دبیر۔ سال تاریخش بزیر دہینہ شد زیب نظم — طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

اعتراض۔ لفظ زُبُر بضمتین ہے نہ کہ بسکون اوسط جیسا کہ اس شعر میں نظم کیا گیا ہے۔

جواب - کتب معتبرۂ لغت سے ثابت ہے کہ اصل لغت میں لفظ مفرد اس مادہ سے جو معنی مناسب معنی مقصود سے رکھتی ہو۔ ایک لفظ زبر بالفتح ہے جو بمعنی کتابت ہے اور زبر بکسر زا وسکون یا مکتوب کے معنے میں ہے اور لفظ زُبُر بضمتیں یا بالضم اول وفتح ثانی صیغہ جمع ہے اور ظاہراً انہیں الفاظ کو معنی مقصود میں نقل کیا ہے۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو ضرور لفظ مفرد معنی مفرد مقصود کے واسطے نقل کی گئی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ زبر دینہ میں لفظ زبر ضرور بضم اول اور فتح اوسط ہے۔ (۲) منتخب میں زبر بضمتین ہے مگر وہ قابل اعتبار نہیں۔ اگر ہے تو یہ ضرورت شعر متحرک کو ساکن کرنا جائز ہے۔ اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بتا دیا جائے کہ کیا کیا چیزیں بضرورت شعر جائز ہیں۔ (۱) وصل - یعنی ایک حرف کا چند حروف معینہ ومبینہ کتب فن سے زیادہ کر دینا جیسے خاقانی کے اس مصرع میں ؎

زادہ سیمرغ کیست جز پدر روستم

(۲) قطع یعنی کسی حرف اصلی کا گرا دینا جیسے خاقانی کے اس مصرع میں کبوتر کو کوتر کہا گیا ہے ؎

ارزن دہ بُرج کوترانش

(۳) تخفیف یعنی حرف مشدد کو مخفف کر کے استعمال کرنا - جیسے غنی کا یہ شعر ؎

گوئی کہ در تنور فلک قحط ہیزم است　　تا اشتہا نہ سوخت نہ شد پختہ نان ما

لفظ تنور مشدّد تھا - (۴) تشدید یعنی حرف مخفف کو مشدّد کر کے کہنا جیسا کہ سعدی ؎

وجود مردم دانا مثال زر طلاست　　بہر کجا کہ رود قدر وقیمتش دانند

زر مخفف ہے مگر مشدد استعمال کیا ہے (۵) ممدودہ الف کو مقصورہ بنا کر استعمال کرنا جیسے اوستاد کا یہ مصرع ؎

ز شش جہات وچہار اخشجاں توئی مقصود

اصل لفظ آخشیج ہے (۶) مقصورہ الف کو ممدودہ بنا دینا جیسے سعدی کے اس شعر میں ؎

شنیدم کہ فرماندہے دادگر　　قبا داشتے ہر دو رو آستر

(۷) اسکان یعنی حرف متحرک کو ساکن کر کے استعمال کرنا جیسے نظامی کا یہ شعر ؎

گشت جہاں از نقش تنگ تر　　وز سپرش معصفرے رنگ تر

لفظ معصفر کا عین مفتوح ساکن استعمال ہوا ہے - (۸) تحریک - یعنی ساکن کو متحرک کر کے استعمال کرنا جیسے فردوسی کا یہ شعر ؎

بفرمود تا بہمن آمدش پیش　　سخن گفت با اُو ز اندازہ بیش

شین آمدش کا ساکن تھا - مگر وزن پورا کرنے کے لئے متحرک استعمال ہوا ہے

(مولف) اگرچہ فاضل مجیب نے جواب دینے میں آسمان وزمین ایک کردیئے ہیں مگر اعتراض اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا یہاں زُبُر بضمتین استعمال کیا گیا ہے یعنی سہواً یا غلطی سے بے کو ساکن کرکے لائے ہیں، رہا یہ قاعدہ کہ سکون جائز ہے۔ اول تو اس میں عجز طبیعت پایا جاتا ہے اسواسطے اکثر لوگ اس سے محترز بلکہ اس قاعدہ سے منحرف ہیں اور یوں تو غلط کلام کی مثال بھی اساتذہ ہی کے کلام سے دیجاتی ہے۔ (دوسرے) ایسے الفاظ کا جو دوسرے زبان کے ہوں اہل زبان کو بدلکر استعمال کرنا جائز ہے مگر دوسرے زبان والوں کو صحیح کی تقلید کرنا چاہئے۔ (۳) منتخب اللغات مستند لغت ہے مجیب نے اسکو غیر معتبر قرار دیا ہے یہ ہرگز قابل تسلیم نہیں ہے۔ مجھے اس جگہ ایک شاعر کا قول اور ایک بادشاہ کا جواب یاد آیا شاعر نے اپنے کسی شعر میں ساکن کو متحرک نظم کیا۔ بادشاہ نے سنکر اعتراض کیا اور پوچھا کہ ایں چیست شاعر نے جواب دیا کہ ایں ہمہ برائے ضرورت شعری است۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ پس شعر گفتن چہ ضرور

طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

مرزا دبیر۔

معترض۔ یہ مصرع قریب قریب ایک اور شاعر کا ہے جو اودھ کے مشہور فرمانروا آصف الدولہ کی تاریخ میں نظم کیا گیا ہے ؎

لکھنؤ بے آصف است و آسماں بے آفتاب | چرخ چارم بے مسیح و طور سینا بے کلیم

جواب۔ شاعر سابق کے کلام کے عنوان پر اور اس کے قریب قریب الفاظ میں شعر کہنا لائق اعتراض نہیں ہے اس طرح کے اکثر شعر موجود ہیں۔

(مولف) یہ صحیح ہے کہ اگر کسی شاعر کا خیال دوسرے سے ملجائے تو وہ قابل ایراد نہیں ہے مگر یہ قاعدہ اسی جگہ کے لئے ہے جہاں بلا ارادہ ایسا ہو جائے۔ ——— مخصوص

اور مشہور مصرعوں کے اور اشعار میں یہ قاعدہ جاری نہیں ہوسکتا اس واسطے کہ جس مصرع تاریخ کو پیش کیا گیا ہے وہ بھی مایۂ ناز تاریخ ہے اور یہ بھی۔ پھر یہ کیونکر کہا جائے کہ مرزا صاحب نے وہ تاریخ نہ دیکھی ہوگی۔ اگر اس قسم کے شعر پر سرقہ کا الزام قایم نہ کیا جائے تب بھی اس بات سے انکار کرنا محال ہے کہ وہ الفاظ اور وہ خیال دوسرے ہی کے شعر سے مستنبط ہوتے ہیں۔ مثلاً اسکے طور پر سعدی کے اس شعر کو لیجئے۔

چہ حاجت کہ نہ کرسی آسماں | نہم زیر پائے قزل ارسلاں

اصل شعر ظہیر فاریابی کا تھا جسکو دیکھے بغیر یہ خیال پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پا | تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں دہد

یا فیضی کی یہ رباعی ؎

فردوس بہ سلسبیل و کوثر نازد　　دریا بہ گہر فلک بہ اختر نازد
عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد　　کونین بہ ذات پاک اکبر نازد

یہ رباعی ایک ایرانی شاعر کی یہ رباعی دیکھنے کے بعد کہی گئی ؎

رومی بہ سنان و تیغ و خنجر نازد　　زنگی بہ سپاہ و خیل و لشکر نازد
اکبر بہ خزینہ پر از زر نازد　　عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد

یا مرزا غالب کا یہ شعر ؎

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست　　قعر دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است

عرفی کا یہ شعر دیکھنے کے بعد کہا گیا ؎

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در جیحون عشق　　روئے دریا سلسبیل و قعر دریا آتش است

ظاہر ہے کہ سعدی کا شعر بالکل ظہیر فاریابی کے برعکس ہے۔ مگر اصلی زور کلام اسی بات سے پیدا ہوا ہے کہ ظہیر نے نہ کرسی اپنے ممدوح کے پاؤں کے نیچے بچھائی ہیں میں ایسا نہیں کروں گا۔ فیضی کی رباعی جواب ہے مگر طرز بیان وہی ہے جو اصل رباعی کی تھی۔ بغیر اُس کو دیکھے یہ نہیں کہی جا سکتی تھی۔ یا غالب کا شعر جواب ہے عرفی کے شعر کا مگر اصل خیال عرفی ہی کا گنا جائے گا۔ بالکل اسی صورت سے مرزا صاحب کا مصرع ہے۔ جو آصف الدولہ ہی کی تاریخ سے لیا گیا ہے۔

خواجہ میر درد[1] و آزاد دہلوی

میر درد۔　مدرسہ یا دیر تھا۔ یا کعبہ یا بتخانہ تھا　　ہم سبھی مہمان تھے تو آپ ہی صاحبخانہ تھا

---

[1] خواجہ میر درد دلی کے اُن شعرا میں سے تھے جن پر دلی کی سرزمین قیامت تک ناز کیا کرے گی۔ میر تقی۔ سودا۔ سوز۔ قائم وغیرہ کے معاصر تھے۔ اور یہ سب لوگ خواجہ صاحب کی عزت کرتے تھے۔ پاک دل پاک صفات عالی ظرف۔ صابر متوکل۔ گوشہ نشین تھے۔ ایک مشاعرہ ہر پندرہویں تاریخ کو اپنے مکان پر کیا کرتے تھے۔ جو آخر میں میر تقی میر کو سپرد کر دیا تھا۔ ان کی غزلوں میں سوز و گداز اس درجہ ہے کہ دیکھ کر درد کی مجسم تصویریں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جو کچھ کہا ہے وہ حال ہے قال نہیں اور بہت سی تصانیف کے علاوہ ایک فارسی اور ایک اردو کا دیوان بھی اُن سے یادگار ہے۔ اردو کا دیوان (بقیہ نوٹ صفحہ ۱۱

اعتراض آزاد - گویا بتخانے کو کثرت استعمال کی وجہ سے ایک لفظ تصور کیا کہ دَیر کے حکم میں ہوگیا - ورنہ ظاہر ہے کہ یہ قافیہ صحیح نہیں ہے -

(مولف) اگرچہ یہ لفظ ترکیب پاکر اتنا مشہور ہوا کہ ایک ہی لفظ سمجھا جاتا ہے یہ صحیح ہے کہ صاحب خانہ کے مقابلے میں مطلع میں یہ قافیہ لانا عیب سے خالی نہیں ہے - شائگاں کا عیب اس میں موجود ہے اور اس کو ایطائے جلی کہہ سکتے ہیں - اگرچہ آج صحیح طور پر یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ درد نے دراصل کیا لکھا تھا - مگر مطبوعہ نسخوں میں یہی ہے -

---

درد - چلئے کہیں اس جاگہ کہ ہم تم ہوں اکیلے　　گوشہ نہ ملے گا کوئی میدان ملے گا

اعتراض آزاد - جاگہ کے علاوہ اکثر جگہ، کی - کے - اور ہے وغیرہ دب دب کر نکلتے ہیں

(مولف) عیب کسی کے یہاں کسی حالت میں بھی کیوں نہ ہو عیب ہی مانا جائے گا - مگر جبکہ وقت زمانہ کا رواج یونہی ہو تو پھر مرگ انبوہ جشنے دارد کا معاملہ ہو جاتا ہے اسی طرح خواجہ صاحب کے دور میں یہی رواج تھا اور چھوٹے بڑے سب ایک حالت میں تھے - اس وجہ سے اس کو عیب نہیں کہہ سکتے -

---

درد - اک لحظہ اور بھی وہ اُڑاتا چمن کا دید　　فرصت نہ دی زمانے نے اتنی شرار کو

اعتراض - دید کو مذکر باندھا ہے -

(مولف) اس کے جواب تین ہیں - ایک تو یہ کہ اس وقت میں دید کو بہ تذکیر بھی لکھتے تھے - اور بہ تانیث بھی جیسا کہ ذیل کی مثال سے معلوم ہوگا -

نظیر - سو کر دفن بناتا سو رنگ روپ بھرنا　　عاشق کو ہر طرح سے خوباں کا دید کرنا

دوسرے یہ کہ قواعد تذکیر و تانیث کی اس وقت کوئی خاص پابندی نہیں کی جاتی تھی - ذیل کی مثالوں سے یہ راز

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۱۸) نہایت مسخ ہو کر چھپا تھا جس کو مطبع نظامی نے صحیح کر کے چھپوایا - مگر وہ صحت ایسی ہے جسے شاید خواجہ صاحب سے کوئی نسبت نہیں ہے - اسی بنا پر میں نے قدیم قدیم نسخوں سے مقابلہ کر کے اس کو مع مقدمہ کے مطبع نولکشور میں شائع کرایا

خواجہ صاحب نے ۱۱۹۹ھ میں دہلی میں انتقال کیا -

آپ نے اپنی عمر میں نہ کسی پر اعتراض کئے نہ آپ کے کوئی منھ آیا - مگر مولانا محمد حسین آزاد نے تذکرہ آب حیات کے لکھتے ہوئے - بعض اعتراضات بھی کئے ہیں جو بجنسہ درج ہیں -

آشکارا ہو جاتا ہے۔

میر حسن چشم کو مذکر لکھتے ہیں۔ حالانکہ مونث بھی اُن کے کلام میں پایا جاتا ہے۔

بٹھا دل کے زخموں کا انگور کیا — کہ پھر چشم خوں بستہ کچھ نم ہوا

مجھے بھی حسن سوجھتا ہے غرض — ڈبو دے گا یہ چشم نم آپ کا

تاب و تواں مذکر۔ میر حسن ؎ وہ تاب و تواں کہاں ہے یارب — جو اس دل ناتواں میں تب تھا

دشنام مذکر " اس لب سے کسی بات کی کیا رکھئے توقع — جس لب سے کہ اک دن کبھی دشنام نہ پایا

شاہ نیاز احمد بریلوی جنگ کو مذکر لکھتے ہیں۔

اسرار حقیقت سے خبردار جو ہوتے — ہفتاد و دو ملت میں کبھی جنگ نہ ہوتا

خم مذکر ہے —— میر ممنون دہلوی مونث لکھتے ہیں ؎

آوے جو تصرف میں مرے میکدہ ساقی — اک دم میں خموں کی خمیں انعام کروں گا

مرگ آج مونث ہے میر مذکر لکھتے ہیں۔

جس صیدگاہ عشق میں یاروں کا جی گیا — مرگ اس شکارگاہ کا صید رمیدہ تھا

گلگشت مونث ہے مگر میر مذکر لکھتے ہیں ؎

یہاں بلبل اور گل پہ تو عبرت سے آنکھ کھول — گلگشت سرسری نہیں اس بارگاہ کا

تلاش مونث ہے سودا مذکر لکھتے ہیں ؎

کرے کیوں سودا نہ دل عبث ہر ملال اہل جہاں سے — خیال زلف دراز گویا تلاش ہے عمر جاوداں کا

عار بتذکیر مستعمل ہے۔ مگر حسرت دہلوی نے بتانیث استعمال کیا ہے ؎

غیر کے پاس روز جاتے ہو — اپنے حسرت سے عار آتی ہے

خلش آج بالاتفاق بتانیث مستعمل ہے مگر سودا نے مذکر بھی استعمال کیا ہے اور اکثر جگہ ؎

؎ زباں ہے شکر میں قاصر شکستہ بالی کے — کہ جس نے دل سے مٹایا خلش رہائی کا

؎ نگاہوں کا ان آنکھوں کے ہے ترچھا پن وہی اب تک — وہی کاوش وہی دل سے خلش رہتا ہے مژگاں کو

؎ خوش ہیں شکستہ بالی سے ہم اپنے اس لئے — پرواز کا تو دل سے خلش دور ہو گیا

متقدمین نے ہر لفظ میں نہایت آزادی سے کام لیا ہے۔ اسی کو مذکر اور اسی کو مونث۔ دم بھر میں کچھ اور دم بھر میں کچھ یہ اعتراض کم نظری ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ کون دعوے کر سکتا ہے کہ خواجہ صاحب نے اسی طرح لکھا تھا۔ اس لئے کہ قافیہ یا ردیف

کی صورت ایسی حالت میں واقع نہیں ہوئی ہو کہ دید کو اس جگہ تانیث نہ پڑھ سکیں

اک لحظہ اور بھی وہ اڑتا چمن کی دید　　　فرصت نہ دی زمانے نے اتنی شرار کو

غرضکہ یہ اعتراض اہل نظر کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

شیخ ابراہیم ذوق[ط] و شاہ نصیر مرحوم

ذوق۔　کوہ اور آندھی میں ہوں گر آتش و آب و خاک و باد　　آج نہ چل سکیں گے پر آتش و آب و خاک و باد

ط　شیخ ابراہیم ذوق دلی کے رہنے والے تھے۔ شاہ نصیر مرحوم کے شاگرد اور ظفر بہادر شاہ آخری تاجدار دہلی کے استاد تھے محاورہ بندی کے ماہر تھے۔ نہایت قانع متوکل نیک مزاج دنیا کے خرخشوں سے بیخبر رہ کر زندگی بسر کرنے والے بزرگوں میں تھے ۱ار ذی الحجہ ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۶۲ھ میں بمقام دہلی انتقال کیا۔ آزاد مرحوم نے اپنے تذکرہ آبحیات میں اُن کے حالات مفصل لکھے ہیں۔

شاہ نصیر دہلوی

آپ کا نام نصیر الدین تھا۔ شاہ غریب نام ایک بزرگ کے خلف اکبر تھے۔ کالا رنگ تھا اس لئے میاں کلو کے عرف سے معروف تھے۔ دلی ہی میں پیدا ہوئے۔ دلی ہی میں ہوش سنبھالا۔ شاعری کی طرف رجحان ہوا۔ اور شاہ محمدی مایل شاگرد قائم کے شاگرد ہوئے۔ اور چند ہی روز میں اس فن میں وہ کمال حاصل کیا کہ خود استاد ہو گئے۔ بادشاہ وقت کو اصلاح دینے لگے۔ لکھنؤ اور حیدرآباد کے بڑے بڑے معرکہ آرا مشاعروں میں بھی شریک ہوئے اور اپنے زمانے کے لحاظ سے اس فن کو معراج کمال پر پہنچا دیا۔ ان کی شاعری کا ممتاز جوہر زباندانی اور مشکل مشکل بحروں میں طبع آزمائی ہے جب زمین کو لیتے ہیں اُسے پانی کرکے بہا دیتے ہیں۔ آخر وقت تک شاعری کرتے رہے ۱۲۵۴ھ میں انتقال کیا۔ ذوق اول اول انھیں سے اصلاح لیتے تھے مگر کچھ اسباب ایسے پیدا ہوئے کہ ناچاقی ہو گئی۔ اور غزلیں دکھانا چھوڑ دیں۔ مولوی محمد حسین آزاد نے شاگرد و استاد کا ایک معرکہ بھی لکھا ہے جو انھیں کی زبان سے سناتا ہوں۔

"کئی برس کے بعد نصیر مرحوم دکن سے پھرے۔ اور اپنا معمولی مشاعرہ جاری کیا۔ شیخ علیہ الرحمۃ کی مشقیں خوب زوروں پر چڑھ گئی تھیں انھوں نے بھی جاکر مشاعروں میں غزلیں پڑھیں۔ شاہ صاحب ذوق نے دکن میں کسی کی فرمائش سے ایک غزل کہی تھی آتش و آب و خاک و باد" وہ غزل مشاعرہ میں سنائی اور کہا اس طرح میں جو غزل لکھے اُسے میں استاد جانتا ہوں۔ دوسرے مشاعرے میں ذوق نے اسپر غزل پڑھی۔ شاہ صاحب کی طرف (ملاحظہ ہو بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۲۲)

اعتراض - سنگ میں آتش کے جلنے کا ثبوت چاہیئے

جواب ذوق - جب پہاڑ کو بڑھنے کے سبب سے حرکت ہے تو اس میں آگ کو بھی حرکت ہو گی۔

اعتراض - سنگ میں آتش کا ثبوت چاہیئے۔

جواب ذوق - مشاہدہ اس کی سند ہے۔

معترض - سند کتابی ہونا چاہیئے۔

جواب ذوق - تاریخ سے ثابت ہے کہ ہوشنگ کے وقت میں آگ نکلی۔

معترض - شاعری میں شعر کی سند درکار ہے۔ تاریخ نہیں چلتی۔

جواب ذوق - محسن تاثیر کا یہ شعر ہے ؎

پیش از ظہور جلوۂ جانانہ سوختیم ؎ آتش بہ سنگ بود کہ ما خانہ سوختیم

سودا - ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا ....

معترض - مگر اس میں آگ کے جلنے کا ثبوت نہیں ہے۔

جواب ذوق - اس میں تغلیب ہے۔

(ملاحظہ ہو بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۲۱) سے اسپر اعتراض ہوئے جشن قریب تھا۔ شیخ علیہ الرحمہ نے بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ اسی طرح میں لکھا۔ مگر پہلے مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کے پاس لے گئے کہ اس کی صحت و سقم سے آگاہ فرمائیں اُنھوں نے سنکر پڑھنے کی اجازت د[illegible] مگر ولی عہد بہادر نے اپنے شقہ کے ساتھ اُسے پھر شاہ صاحب کے پاس بھیجا۔ انھوں نے جو کچھ کہا تھا وہی جواب میں لکھدیا اور یہ شعر بھی لکھا۔

بود بگفتۂ من حرف اعتراض چناں ؎ کسے بدیدۂ بینا فرو برد انگشت

شیخ مرحوم کا دل اور بھی قوی ہو گیا - اور دربار شاہی میں جا کر قصیدہ سنایا - اس کے بڑے بڑے چرچے ہوئے اور کئی دن کے بعد سنا کہ اس [illegible] اعتراض لکھے گئے ہیں۔ شیخ مرحوم قصیدۂ مذکور کو مشاعرے میں لے گئے کہ وہاں پڑھیں - اور روبرو بر سر معرکہ فیصلہ ہو جائے۔ چنانچہ قصیدہ پڑھا گیا۔ شاہ نصیر مرحوم نے ایک مستعد طالب علم کو کتب تحصیلی خوب رواں تھیں جلسہ میں پیش کر کے فرمایا کہ انھوں نے اسپر [illegible] اعتراض لکھے ہیں۔ شیخ علیہ الرحمہ نے عرض کی کہ میں آپ کا شاگرد ہوں اور اپنے تئیں اس قابل نہیں سمجھتا کہ آپ کے اعتراضوں [illegible] قابل خطاب ہوں۔ انھوں نے کہا کہ مجھ سے کچھ تعلق نہیں اُنھوں نے کچھ لکھا ہے۔ شیخ مرحوم نے کہا خیر تحریر تو اسی وقت تک [illegible] کہ فاصلۂ دوری درمیان ہو۔ جب آمنے سامنے موجود ہیں تو تقریر فرمایئے"

چنانچہ اس کے بعد بحث شروع ہو گئی۔ ذوق مرحوم نے اپنا مطلع پڑھا -

معترض۔ یہ تغلیب کہیں نہیں آئی۔

(مولف) ذوق مرحوم کا جواب صحیح ہے رہا تغلیب کا مسئلہ وہ یہ ہے کہ تغلیب اصطلاح میں ایک چیز کو دوسری چیز کے ماتحت لانے کو کہتے ہیں۔ معترض کا یہ خیال بھی صحیح نہیں تھا کہ ایسی تغلیب کہیں نہیں آئی یہ تو ظاہر ہے کہ ایک چیز کی مثال بجنسہ پیش کرنا دشوار ہے۔ مگر تغلیب کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے محسن تاثیر کا یہ شعر ہے۔ اس میں آب کو جارو (جاروب) کے تحت میں لایا گیا ہے۔ کیونکہ کشیدن کا تعلق جاروب سے ہے نہ کہ آب سے ؎

تا بگیر د منصب دیدار جاناں دیدہ ام — آب جاروبی کشد از اشک مژگاں دیدہ ام

اسی طرح چلنا اگرچہ آتش کے لئے نہیں ہے مگر ذوق کے شعر میں آتش کو آب کے تحت میں لایا گیا ہے۔

دیگر معترضین کے اعتراضات

ذوق۔ سر بوقت ذبح اپنا اُس کے زیر پائے ہے — یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

معترض۔ پا۔ میں (ی) کا زیادہ کرنا بغیر اضافی یا صفتی ترکیب کے جائز نہیں ہے۔

جواب آزاد۔ یہ معترض کی کم نظری ہے۔ سعدی کا یہ شعر ایسا ہی ہے ؎

درختے کہ اکنوں گرفت است پائے — بہ نیروئے شخصے بر آید ز جائے

(مولف) آزاد کا جواب صحیح تو ضرور ہے مگر پھر بھی ذوق کے اس شعر میں زیر پائے کی جگہ زیر پائے کچھ فصیح نہیں ہے۔

ذوق۔ دانہ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو — آئے ہے جزو میں نظر کل کا تماشا ہم کو

اعتراض۔ جُز صحیح نہیں جزو ہونا چاہئے

جواب آزاد۔ یہ اعتراض بھی صحیح نہیں خسرو لکھتے ہیں۔

ہر چہ کنند در جز و در کل اثر

میر تقی میر۔ جُز مرتبہ کل کو حاصل کرے ہے آخر — اک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہوگا

(مولف) آزاد کا جواب صحیح ہے۔ جز۔ اصل میں جزء بہمزہ ہے۔ مگر جب اس کو کسی کی طرف مضاف کرتے ہیں تو یہ ہمزہ واو سے بدل جاتا ہے۔ جیسے کہ جزو بدن۔ جزو طلا وغیرہ۔ مگر فارسی والوں نے اس کو بغیر واو کے بھی استعمال کیا ہے۔

ذوق واوج[1]

ذوق۔ مقابل اُس رُخ روشن کے شمع گر ہو جائے صبا وہ دھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

اعتراض۔ یہ تصرف فی المحاورہ ہے۔ اس محاورہ کو یوں باندھنا چاہیئے جیسے ہم نے باندھا ہے[1]

یاں جو ہر گل خورشید کا کھٹکا ہو جائے ڈھول دستار فلک پر لگتے تڑکا ہو جائے

جواب ذوق۔ شمع کو صبح ہوتے ہاتھ مار کر بجھا دیتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر شمع مقابلہ کرے تو اس گستاخی کی سزا میں صبا اُسے ایسی دھول مارے کہ وہ بجھ جائے اور ایسی بجھے کہ وہی اس کے حق میں سحر ہو جائے یعنی روشنی نصیب نہ ہو۔

جواب آزاد۔ ناسخ کا یہ شعر بھی اسی ترکیب کا ہے۔

جو ستمگر ہیں کبھی وہ پھولتے پھلتے نہیں سبز ہوتے کھیت دیکھا ہو کہیں شمشیر کا

محاورہ میں تلوار کا کھیت کہتے ہیں شمشیر کا کھیت نہیں ہے۔

(مولف) اگرچہ استادوں نے اس قسم کے محاورات میں تصرفات کئے ہیں اور تلاش کرنے پر بہت سے شعر مل سکتے ہیں مگر وہ سب غلط ہیں کیونکہ محاورہ میں تصرف جائز نہیں۔

ذوق۔ منھ اٹھائے ہوئے جاتا ہے کہاں تو کہ تجھے ہے ترا نقش قدم چشم نمائی کرتا

اعتراض نواب کلب حسین خاں نادر۔ کہ تجھے، پہلے مصرع میں لایا گیا ہے یہ دوسرے مصرع کا حق ہے۔

جواب آزاد۔ اس کا جواب مجھے نہیں آتا۔

(مولف) آزاد نے یہ طنزاً لکھا ہے۔ کہ اس کا جواب نہیں آتا۔ اصل یہ ہے کہ یہ اعتراض معترض کی نادانی پر مبنی ہے اس قسم کے ہزارہا شعر موجود ہیں۔ جو اساتذہ کے دواوین سے مل سکتے ہیں۔

---

[1] اوج مرحوم کا نام عبداللہ خاں تھا سرہند کے رہنے والے تھے۔ مگر ہمیشہ دلی میں رہتے تھے۔ اگرچہ انکی علمی استعداد معمولی تھی۔ مگر طبیعت میں رسائی۔ اور فکر میں خداداد تیزی تھی سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کرتے تھے اور اپنے معاصرین غالب و ذوق وغیرہ پر خوب خوب چوٹیں کرتے تھے۔ بنانے والے تو قیامت کے ہوتے ہیں۔ بنانے کے لئے انکو استاد کہا کرتے تھے۔ اور یہ بھی اس سے خوش ہوتے تھے۔ مرزا منگو، مجزوں کی سرکار میں ملازم تھے۔ ۱۲۸۳ھ میں انتقال کیا۔

ایک مرتبہ ذوق نے مشاعرہ میں غزل پڑھی جس کا مطلع یہ تھا۔

ہاتھ میں خاتم لعل کی ہے اس میں زلف سرکش ہو　　پھر زلف بنے وہ دست موسیٰ جس میں انگر آتش ہو

شاہ نصیر نے اس خیال سے کہ پہلے مصرع میں سبب خفیف کی کمی ہے اعتراض کہا کہ پھر پڑھو، ذوق سمجھ گئے اور فوراً کمی کو پورا کر کے جواباً یوں پڑھا۔

جس ہاتھ میں خاتم لعل کی ہے الخ

ذوق۔　نرگس کے پھول بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر　　ایما یہ ہے کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر

اعتراض شاہ نصیر۔ پھول بٹوے میں نہیں ہوتے یوں کہنا چاہیئے ؎

نرگس کے پھول بھیجے ہیں دونے میں ڈال کر

اعتراض ذوق۔ دونے میں رکھنا ہوتا ہے ڈالنا نہیں ہوتا۔ یوں ہونا چاہیے ؎

بادام دو جو بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر　　ایما یہ ہے کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر

(مولف) اعتراض شاہ نصیر کا صحیح تھا مگر اصلاح صحیح نہیں تھی ذوق مرحوم نے صحیح مصرع لگایا۔

ریاض[51] خیر آبادی و حکیم ناطق لکھنوی

ریاض۔　آنکھیں ہمیں قدموں سے وہ ملنے نہیں دیتی　　ہم چٹکیوں سے دل کو مسلنے نہیں دیتے

---

[51] جناب ریاض احمد صاحب ریاض کا مولد و مسکن خیر آباد ضلع سیتاپور ہے۔ آپ کی عمر اس وقت ستر چھتر سال سے متجاوز ہو گی آپ منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی کے شاگرد ہیں اور آج ہندوستان میں ایک سر برآوردہ استاد ہیں۔ آپ کی شاعرانہ شوخیاں آپکے ایک ایک شعر سے نمایاں ہوتی رہتی ہیں۔ خصوصیت سے شراب کے مضامین جیسے آپ کے یہاں پائے جاتے ہیں ایسے ہندوستان میں کسی شاعر کے یہاں نہیں ہیں۔ شوخی بیان۔ معاملہ بندی طرز ادا وغیرہ میں آپ کو ید طولےٰ حاصل ہے ادنیٰ مضمون کو آپ نے حسن بیان سے اس طرح نادر کر کے پیش کرتے ہیں کہ سامعہ خواہ مخواہ لطف اندوز ہوتا ہے۔ ابتک دیوان طبع نہیں ہوا۔ مگر اس مرتبہ جنوری ۱۹۳۱ء میں جو مجھ سے ملاقات ہوئی تو ارادہ ظاہر ہوا کہ اب عنقریب شائع ہو گا مجھ پر نہایت ہی مہربانی فرماتے ہیں، اور اکثر لکھنؤ کی آمد و رفت کے سلسلہ میں غریب خانے پر قدم رنجہ فرماتے ہیں۔ نیک نہاد فرشتہ خو۔ عالی ظرف۔ مرنجاں مرنج صلح کل بزرگ ہیں۔ جوانی کی وجاہت بڑھاپے کا وقار (ملاحظہ ہو بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۲۶)

اعتراض ناطق - حاصل شعر یہ ہے کہ وہ ہم کو اپنے تلوؤں سے آنکھیں نہیں ملنے دیتے ہم ان کو اپنا دل چٹکیوں سے مسلنے نہیں دیتے۔ مناسبات الفاظ کی خوبیاں تو اچھی ہیں۔ ادہر آنکھیں ادہر دل۔ ادہر پاؤں ادہر چٹکیاں یعنی ہاتھ ادہر ملنا۔ ادہر مسلنا۔ یہ الفاظ آپس میں ایک دوسرے سے لفظی مناسبت رکھتے ہیں۔ مگر لفظی مناسبات کا خیال یا شعر میں اس خیال کا جزو اعظم ہونا شاعری کے اعلیٰ رنگوں میں نہیں بلکہ ادنی اور بالکل ادنی۔ انہیں وجود سے امانت کی شاعری بدنام ہوئی۔ اور لکھنؤ کو ان کے نام سے ہر گز فخر نہیں۔ اور اسی وجہ سے شرفائے لکھنؤ نے ضلع جگت

(ملاحظہ ہو بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۲۵) بنکر رہ گئی ہے۔ مگر پھر بھی ہر بات چٹکلا۔ ہر لفظ ایک لطیفہ ہوتا ہے۔ زمانہ کے افکار و حوادث کا شکار ہو رہے ہیں۔ مگر ممکن نہیں کہ کوئی دیکھنے والا یہ بھی سمجھ لے کہ اس وقت کسی فکر میں ہیں۔ ہر وقت خندہ پیشانی بزرگوں میں بزرگ جوانوں میں جوان۔ بڈھوں میں بڈھے ہیں۔ علم کے ساتھ اب عمل کو بھی شامل کر لیا ہے۔ یاد خدا میں مشغول رہتے ہیں اور کبھی کوئی نماز قضا نہیں ہوتی وضعداری کا یہ عالم کہ جس سے ایک دفعہ مل لئے عمر بھر کے لئے اس کے دوست ہوگئے۔ تحمل کا یہ حال کہ آج تک کسی پر شاید اعتراض نہیں کیا۔ خودداری کا یہ رنگ کہ ساٹھ برس شاعری کی دنیا میں آئے ہوئے گزر گئے مگر کبھی واہ وا کی لالچ پر کسی مشاعرہ میں شریک نہیں ہوئے اللہ اللہ مولانا حالی کا ایک شعر یاد آتا ہے۔

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں — اب یہ شکلیں نہ دکھائے گا زمانا ہر گز

یہی حال ریاض کا ہے۔ اب کیوں ایسے لوگ پیدا ہوں گے اور کیوں لوگ ایسی متبرک ہستیاں دیکھیں گے۔

حکیم ناطق لکھنوی

آپ کا نام نامی حکیم سعید احمد ہے آپ ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے خاندان کے تعلقات سادات بلگرام و شیوخ انصاری سے ہیں۔ کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اردو کی شاعری میں اس وقت اُستاد ہیں۔ کانپور میں مطب فرماتے تھے اور وہاں آپکی شاعری عروج پر تھی بہت سے شاگرد پیدا کئے تھے مگر اتفاق سے چند مصالح کی وجہ سے بغرض مطب کلکتہ چلے گئے۔ دو تین برس وہاں رہکر واپس چلے آئے۔ پھر چند روز لکھنؤ میں رہکر حیدر آباد گئے۔ اس زمانہ میں مستقلاً لکھنؤ میں قیام ہے۔ نہایت آزاد طبع یار باش آدمی ہیں۔ مگر تنقید میں آپ کو ایک قدرتی ملکہ حاصل ہے۔ بہت سی تنقیدیں آپ نے مشاہیر کے کلام پر لکھی ہیں جو وقتاً فوقتاً ملک میں شائع ہوتی رہیں۔ اور اسیوجہ سے خود لوگوں نے بھی آپ پر کافی تنقیدیں لکھیں۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ آپ کو فن تنقید پر اچھا عبور ہے۔ اور اس میں وہ کسی دوست دشمن کا خیال نہیں کرتے۔ آپ سر دست مرزا فخر اللہ بیگ صابر کے دولت خانہ پر حسین گنج میں قیام پذیر ہیں۔ آپ کی تنقیدی زد میں غریب ریاض بھی آگئے ہیں اور آپ نے ان کی ایک غزل پر اس طرح اپنی رائے کا اظہار فرمایا ہے۔ یہ تنقید رسالہ معیار جولائی ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی تھی۔

کا شغل بالکل متروک کر دیا۔ کیونکہ اس کو ادنےٰ لوگوں نے اختیار کر لیا ہے۔ یہاں تک مضائقہ نہیں بلکہ حسن ہے اگر خود بخود الفاظ مناسب ہو جائیں۔ اور جزو اعظم معنوی مناسبات رہیں۔ اور اگر شاعر کا مقصود اصلی رعایت الفاظ ہو تو وہ شاعری دنیا کا گویا سفلی مذاق ہے۔ اس شعر میں اگرچہ یہ ظلم مضمون پر نہیں کیا گیا۔ کہ الفاظ مناسب ہوں چاہے معانی خاک میں مل جائیں اور بد مذاق ہو جائے۔ مگر چونکہ خاص توجہ اس کے مذاق کی طرف موزوں کرتے وقت نہ رہی اس واسطے فن شاعری کی بے پناہ نزاکتوں نے معمولی اسقام پیدا کر دیئے وہ یہ کہ معشوق سے بدلہ لینے کی غرض سے اس کو ایک مزہ دار ظلم سے باز رکھنا۔ یعنی چٹکیوں سے دل مسلنے سے روکنا۔ اور دل کو اس سے بچانا کوئی خوبصورت شوخی اور عاشقانہ انداز نہیں۔ حالانکہ ذہن نقاد۔ جواب بھی اچھا خاصہ دیتا ہے۔ کہ بدلہ بھی کس بات کا لیا جاتا ہے اس بات کا کہ وہ آنکھوں کو اپنے تلووں سے ملنے نہیں دیتے۔ اور یہ خاص عاشقانہ مذاق ہے مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بدلہ ٹھیک نہیں کیونکہ چٹکیوں سے دل کا مسلنا اک طرح کا ظلم ہے۔ اور معشوق کے تلووں سے کسی عاشق کو اپنی آنکھیں ملنا اعلیٰ درجہ کی راحت ہے۔ تو اپنے کو راحت نہ پہونچنے کے معاوضہ میں معشوق کو ایسے ظلم سے جو اس کی فطرت میں ہو باز رکھنا خود غرضی ہے۔ اور عاشقانہ اخلاق کے بالکل خلاف اور علاوہ اس کے عقلاً بھی یہ معاوضہ کچھ بے جوڑ سا ہے۔

(مولف) جہاں تک ناطق صاحب نے مناسبات کے متعلق کچھ لکھا ہے وہ بھی اگرچہ بیش بہا افتادہ باتیں ہیں۔ مگر پھر بھی مجھے اُن سے حرف حرف اتفاق ہے۔ مگر یہ کہنا کہ ریاض صاحب نے اس شعر میں توجہ اس طرف زیادہ منعطف فرمائی ہے۔ اور وہ امانت مرحوم کی طرح اس رنگ کے کہنے کے لئے بیٹھے ہیں سراسر شاعری اور سخن فہمی پر ظلم کرنا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ شعر اعلیٰ نہیں۔ مگر یہ اعتراضات معجون خانہ ساز کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور ان کا جواب صرف یہی ہے کہ تھوڑی سی کاوش کے بعد دنیا کے بہتر سے بہتر شعر میں ایسی ہی غلطیاں نظر آجائیں گی مختصر یہ کہ جہل مرکب سے دنیا کی فطرت ہے اور حکیم صاحب بھی اسی دنیا میں ہیں پھر یہ اعتراض کہاں تک انصاف پر مبنی ہو سکتا ہے۔ اعتراض کرتے ہیں پھر جواب دیتے ہیں۔ پھر اعتراض کرتے ہیں۔ اور چاہتے تو پھر کوئی جواب دے لیتے۔ در اصل نہ یہ اعتراض اعتراض ہیں۔ نہ جواب جواب ہیں۔ خدا معلوم کیا ہیں۔

ریاض جلتا ہوں بچاتے ہیں اسی سوز دروں سے — دشمن کو مری آگ میں جلنے نہیں دیتے

اعتراض۔ مصرع اولیٰ میں اتنے الفاظ موزوں نہو سکے۔ جو مفہوم کو صفائی سے دکھلا دیں (جلتا ہوں) یہ ٹکڑا علیحدہ ہے۔ اور سوز دروں کا مضاف الیہ مقدر ہے۔ ان دو وجہوں سے عبارت فصیح نہ رہی کیونکہ جلتا ہوں کے بعد کاف

بیانیہ ہوتا تو فصاحت کا پہلو نہ دبتا۔ اور سوز دروں کا مضاف الیہ ظاہر ہوتا تو بہتر تھا۔ نہیں معلوم کہ شاعر کا مقصود اپنے سوز دروں سے ہے یا غیر کے۔ شان عبارت غیر کو مضاف الیہ بتاتی ہے۔ اور معنوی نزاکت کہتی ہے کہ عاشق کا سوز دروں ہے کیونکہ دوسرے مصرع میں جو مری آگ ہے اسی کی طرف سوز دروں کی شعاعیں رُخ کر رہی ہیں۔ عبارت اور معنی میں تناقص اور معانی و بیان کے خلاف ہے۔

(مولف) اگرچہ شعر اپنے بندش کے لحاظ سے چست نہیں ہے۔ مگر مطلب بالکل صاف ہے۔ سوز دروں کا مضاف الیہ دشمن ہے جو الفاظ سے ظاہر ہے۔ اتنی کمی ضرور ہے کہ جلتا ہوں کے بعد کاف بیانیہ نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے شعر میں گنجلک ہے۔

ریاض۔ بوسے لئے کیا ہیں نے جو بل کھاتے ہیں گیسو — تم کالوں کو کیوں زہر اگلنے نہیں دیتے

اعتراض۔ پہلے مصرع میں گیسوؤں کے اظہار غضب سے اختلاف ہے۔ اور دوسرے مصرع میں اتفاق ہاں اگر کالوں سے کالے سانپ مراد ہیں تو یہ تناقص رفع ہو جاتا ہے۔ مگر یہ کوئی بات نہیں ہے نہ کوئی تعلق ہے۔

(مولف) میرے نزدیک شعر مہمل سا ہے اور کوئی اچھے معنے نہیں نکلتے معترض کی رائے صحیح ہے۔

ریاض۔ آئی ہے یہ کہتی ہوئی کس کی شب فرقت — ہم رنگ زمانہ کو بدلتے نہیں دیتے

اعتراض۔ کس کی سے جو ابہام پیدا ہوتا ہے وہ کچھ لطف نہیں دیتا۔ سوائے معشوق کے اور کس کی فرقت کی رات ہو سکتی ہے۔ اور ایک معنوی شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب شب فرقت پہلے نہ تھی اور اب آئی ہے تو رنگ زمانے کا بدل ہی گیا۔ پھر اس کا یہ کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ تغیرات کے مخالف تو وہ اسوقت ہو سکتی تھی کہ عاشق کے گھر میں ہمیشہ سے ہوتی۔ جب وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ آئی تو رنگ بدلنے کی محرک ہو گئی۔

تصحیح

گزشتہ ماہ حضرت حفیظ جالندھری کا ایک شعر غلط لکھا گیا ہے۔ وہ شعر فی الاصل یوں ہے:۔

بڑھی ہو گئی تہذیب نو سیلاب کی صورت — ہے جس کے حلقۂ ہر موج میں گرداب کی صورت